"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے"

روشنی کی بشارت

(افسانے)

حیدر قریشی

تجدید اشاعت گھر

اسلام آباد۔لاہور

انٹرنیٹ ایڈیشن

"جو پتھر معماروں نے رد کیا
وہی کونے کا سرا ہو گیا۔۔۔"
(حضرت مسیح علیہ السلام)

ضابطہ

(جملہ حقوق بحق مصنف)

کتاب کا نام:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔روشنی کی بشارت

مصنف:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حیدر قریشی

تاریخ اشاعت:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۹۹۲ء

تعداد:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۵۰۰

قیمت:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۱۰۰ روپے

سرورق:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔شبہ طراز

ناشر: تجدید اشاعت گھر

اسلام آباد۔لاہور

انٹرنیٹ ایڈیشن ۲۰۱۴ء

ایک شام سادھو نے آکاش پر ایک تیز روشنی مشاہدہ کی جو آہستہ آہستہ نیچے اترتی شدودھن کے محل میں جا کر ختم ہو گئی۔ سادھو اس نورانی ہالہ کی تلاش میں مہاراجہ کے محل میں آیا تو وہاں ننھے سدھارتھ کو دیکھا۔

(گوتم بدھ کے بچپن کا واقعہ)

''وہ آسمانوں کا چمکتا ہوا سورج دکھائی دیتی ہے جو ادریس کے سینے میں ہے۔

وہ یسوع ہے، روشنی میں توریت۔ وہ رومی کلیسا کی بیٹی ہے۔ وہ ہمارے مذہب، زبور اور یہودی اور مسیحی بزرگوں کی فراست میں ہے۔ جس دن وہ وداع ہوئی، میں نے اپنے صبر کو پکارا۔ اور جب میں قریب المرگ تھا تو میں نے اس کے جمال اور حُسن سے شفا چاہی۔۔۔ اور وہ رضا مند ہو گئی۔۔۔۔

میرا دل ہر حال پر قادر ہے، جہاں راہب کے لیے خانقاہ اور بتوں کے لیے معبد، ہرنوں کے لیے چراگاہ اور حج کو آنے والوں کے لیے کعبہ ہے۔ جہاں توریت کے نسخے اور قرآن کی سورتیں ہیں۔ میرا مذہب عشق ہے اور جہاں میرے اونٹوں کی نکیل مڑتی ہے وہیں میرے ایمان کی سچائی ہے۔''

(اقتباس از ترجمان الاشواق: **حضرت محی الدین ابن العربی**)

''میں ایک مخفی خزانہ تھا
سو میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں
پس میں نے آدم کو تخلیق کیا''
(حدیث قدسی)

فن

بے حد عجز و انکسار
تعظیم و تکریم اور
محبتوں کے ساتھ
کائنات کے سب سے قدیم اور سب سے عظیم تخلیق کار

اپنے پیارے خدا کے نام

اظہار

ابلاغ

''وہ منشوں کے بھاؤ خیال سے بالا
دنیا کو تخلیق کرنے والا پرماتما ہے'' **(منو)**

اور خداوند آسمان سے گرجا۔۔۔۔۔۔۔
سمندر کی تھاہیں ظاہر ہوئیں۔
کرّۂ ارض کی بنائیں نمودار ہوئیں۔۔۔۔۔۔
اُس نے بلندی سے ہاتھ بڑھا کر مجھے تھام لیا
اور پانی کی زیادتی میں سے کھینچ کر مجھے نکالا
میرے زور آور دشمن سے اس نے مجھے چھڑایا

تو، اے خدا! میرا چراغ روشن کرتا ہے۔
اے خدا تو میری تاریکی کا نور ہے!
(زبور)

ترتیب

روشنی روشنی سی ہر سُو ہے
یہ ترا دھیان ہے کہ خود تُو ہے

حیدر قریشی کی افسانہ نگاری

پروفیسر جیلانی کامران

(۱

نئے اردو افسانے نے جہاں انسان کو معاشرے کے حوالے سے بیان کرنے کی روایت قائم کی ہے وہیں معاشرہ کو جن اصولوں کے تحت زیر بحث لایا ہے ان اصولوں نے معاشرے کی آب و ہوا کو ویران کر دیا ہے اور انسان کو اس کے ذہنی اور فکری پس منظر سے محروم بھی کیا ہے۔ غالباً اسی لیے نئے افسانے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ افسانہ بے آسرا انسان اور بے آباد زمین کی روداد بیان کرتا ہے۔ اسی ضمن میں ایک بات یہ بھی سننے میں آئی ہے کہ نیا افسانہ محض رودادِ ذات ہے اور اس کے رگ و ریشے سے کہانی پیدا نہیں ہوتی۔ ضمیر متکلم کی روداد نمایاں ہوتی ہے۔ اور ضمیر متکلم اپنے طور پر شکست و ریخت سے دوچار ہے۔ اس لیے اس مرکزی استعارے ضمیر متکلم کی مدد سے افسانے کا انسانی تاثر واضح نہیں ہوتا۔ بلکہ نفسیاتی اعتبار سے ایک مرضیاتی زائچہ تیار ہوتا ہے۔ ایسے رویوں کی موجودگی میں حیدر قریشی کے افسانوں کا مجموعہ "روشنی کی بشارت" ایک نئے تخلیقی قدم اور نئے فکری اعتماد کی خبر دیتا ہے۔

حیدر قریشی نے اپنے افسانوں کی دنیا اسی ماحول سے اخذ کی ہے۔ جس ماحول سے نیا افسانہ بخوبی آشنا ہے۔ لیکن حیدر قریشی نے اس ماحول کو ایک فکری مسئلے کے طور پر قبول کیا ہے۔ اور

اس مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان افسانوں کے اندر موجود انسان کو اعتماد کے رویے فراہم کیے ہیں۔ ان افسانوں کی دنیا ایسی ہے جس کی اندھیری جہتوں سے باہر نکلنا دشوار ہے۔ اس لیے ان کہانیوں کے افراد اندھیرے شب و روز میں اپنے ہونے اور نہ ہونے کے آشوب سے دوچار ہیں۔ ان کی نظر میں سچائیاں اضافی ہو چکی ہیں۔ اور وہ سچائیوں کی راہنمائی کے بغیر اپنے لیے کوئی بہتر ساعت بھی دریافت نہیں کر سکتے۔ ایسے غیر فطری منظر میں کبھی وہ شک اور یقین کے دوراہے سے گزرتے ہیں اور کبھی ان کا اپنا وجود ٹوٹ کر من اور غیر از من میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ دھند کے بخشے ہوئے راستوں میں سفر کرتے ہیں اور اپنے ماضی کو اپنی خطاؤں کا مجرم گردانتے ہیں۔ تاہم ان افسانوں کے لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو الزام دینے سے کتراتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی زندگی کو بے معنی صورت مہیا کرنے پر برابر تیار دکھائی دیتے ہیں۔ اور جس دنیا سے ان کا سابقہ ہوا ہے اس کی اپنی رفتار صرف ہلاکت ہی کی منزل کو قریب لاتی ہے۔ اس اعتبار سے ان افسانوں کے بطن میں ہلاکت کا غیر محسوس سفر جاری نظر آتا ہے اور سارے کے سارے افراد اس سفر کو قبول کر کے برابر بے حس ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس صورتحال کو رنگوں کا استعارہ بخوبی بیان کرتا ہے جہاں سبز رنگ پیلے رنگ میں بدل جاتا ہے اور سرخ خون سفید ہونے لگتا ہے! ان افسانوں کی دنیا میں شدید دباؤ، نفسیاتی بحران اور فرد اور گروہ کے مابین غیریت کا پھیلتا ہوا سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ انسان اپنے بحران کے چنگل میں پریشان' یک و تنہا اپنی ویرانیوں کو وسیع سے وسیع تر کرتا چلا جاتا ہے!

حیدر قریشی نے اس انسانی معروض کو ایک سوال کی صورت میں بیان کیا ہے اور قاری کے ذہن میں بار بار یہ ضمنی سوال ابھرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟ اور ایسا کس لیے ہے؟

(۲

حیدر قریشی نے اپنے افسانوں کے لیے جس نوع کے عنوان چنے ہیں وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیونکہ ان کی مدد سے اس افسانوی دنیا کی آب و ہوا مرتب ہوتی ہے جس میں قاری کو

سفر کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔اس افسانوی دنیا میں صحرا، آسمان کے بدلتے ہوئے رنگ، رات اور ایک ایسا طرزِ احساس مرکزی ہیں جن سے ایک انجانا خوف پھوٹتا ہے۔اس خوف کی توجیہہ کے لیے کبھی جرنلزم کی سرخیوں کو شریک کیا گیا ہے، کبھی ایٹمی جنگ کے ہلاکت خیز امکان کو منظر میں سمویا گیا ہے اور کبھی عصرِ حاضر کے ان عالمی تعلقات کو انسانی صورتحال میں شامل کیا گیا ہے جہاں درآمدی گندم اور تیل کی پیداوار سرفہرست دکھائی دیتی ہیں ۔ اس اعتبار سے حیدر قریشی کے افسانوں کی دنیا عصرِ حاضر کے حالات، واقعات اور امکانات سے رونما ہوتی ہے۔اور رونما ہوتے ہی انسانوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔اس مقام تک حیدر قریشی اجتماعی کیفیت کو ہمراہ لے کر چلتے ہیں ۔لیکن بہت جلد یہ اجتماعی کیفیت اپنے بطن سے انفرادی کیفیت اخذ کرتی ہے۔اس تخلیقی عمل کے ساتھ ضمیر متکلم آشکار ہوتی ہے اور یہ صورت حیدر قریشی کے افسانوں کو اور ان افسانوں کے مرکزی انسان کو انفرادیت فراہم کرتی ہے۔

نئے افسانے کے آداب اور مزاج کی روشنی میں یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ نیا افسانہ اپنے منظر کی بجائے اپنے انسان کے گرد گردش کرتا ہے اور اس کا انسان ہی اس کا محور ہے۔لیکن نئے افسانے کے لکھنے والے عموماً حالات اور فرد کا رشتہ تخلیق کرتے ہوئے فرد کے مقابلے میں حالات کو بے حد طاقت ور بتاتے ہیں اور اس تناسب سے فرد کی انا کو برابر کمزور ہوتے دکھاتے ہیں ۔ایسا فرد افسانے کی دنیا میں حالات کے جبر سے شکست کھاتا ہے اور حالات کے پیدا کئے ہوئے ماحول میں اپنے ٹوٹے ہوئے وجود ہی کی نشاندہی کرتا ہے۔حیدر قریشی کے افسانوں میں ایسے حالات بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔اس لیے ان افسانوں کا انسان وجود کی شکست وریخت سے دوچار نہیں ہوتا۔اس کی انا برابر قائم رہتی ہے اور وہ ہر لمحے حالات کو غلبہ پانے سے روکنے کی سعی کرتا ہے۔ایسا اندازِ نظر اس لحاظ سے بھی قابلِ توجہ ہے کہ افسانہ جس دنیا کی نشاندہی کرتا ہے اس میں فرد کا طرزِ عمل تہذیبی رویوں کی ترجمانی کرتا ہے۔فرد کے ٹوٹنے سے تہذیبی شعور میں دراڑیں رونما ہوتی ہیں۔ حیدر قریشی کا افسانہ اس تہذیبی دوراہے کا ازالہ کرتا ہے۔

(۳

افسانے کی اس دنیا میں جسے حیدر قریشی نے دریافت کیا ہے۔روشنی کی کرن ایک ایسا استعارہ ہے جسے ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔روشنی کی کرن رات کے پچھلے پہر ظاہر ہوتی ہے۔کبھی اس کے ساتھ انسانی شعور کے وہ رشتے آشکار ہوتے ہیں جن کی ترتیب آسمانی نشانات نے کی ہے۔اور کبھی یہ کرن امید بن کر گلاب کے پودے کی صورت اختیار کرتی ہے اور کبھی محبت بن کر دل میں ظہور کرتی ہے۔ یہ کرن کشف اور رویا بن کر دل کا خوف دور کرتی ہے اور سفید پرندوں کو اپنے پاس بلاتے ہوئے انسانوں کو وحدت کی دعوت دیتی ہے۔حیدر قریشی نے اس استعارے کو جابر ماحول سے رہائی پانے کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔تاہم یہ استعارہ جہاں ماحول اور فطرت اور آرزوئے قلب میں ظاہر ہوتا ہے وہیں اس استعارے کی توانائی اس حقیقت میں بھی مضمر ہے کہ اس استعارے کو الہامی اور آسمانی نشانات نے آلِ آدم کی تربیت میں نسل در نسل راسخ کیا ہے۔ اس لیے روشنی کی کرن نہ تو گم ہوتی اور نہ دجل و بطلان کے دبیز پردے اسے آنکھوں سے اوجھل رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ انسان کے آخری سہارے کے طور پر یہ استعارہ انسان کی زندگی کی ضمانت دیتا ہے حیدر قریشی نے اس استعارے کو اپنے افسانوں میں مجسم کیا ہے اور اس کی مدد سے اپنے مرکزی کرداروں اور ضمیر متکلم کی تشکیل کی ہے۔اگر اس زاویے سے دیکھا جائے تو حیدر قریشی کے افسانے انسان کی امکانی صورتحال کو پیش کرتے ہیں اور یوں روشنی کی کرن کو انسانی فلاح کا مرجع قرار دیتے ہیں۔''حوا کی تلاش'' جو ان افسانوں میں اہم رمزیت کی حامل ہے ایسی ہی صورتحال سے عہدہ برآء ہوتی ہے۔اور روشنی کی کرن جدید عہد کی ٹیکنالوجی کے ہمراہ ایک نئے زمانے کی بنیاد رکھتی ہے۔اسی مجموعے کی ایک دوسری کہانی (گلاب شہزادے کی کہانی) میں گلاب کا پھول انسان کی ابدی حکمرانی کا سمبل ہے لیکن اس سمبل کو انسان کی ہوس اور نظامِ زیست کے جبر نے پامال کر رکھا ہے۔ان دونوں کہانیوں سے ایسے اشارے بخوبی حاصل کیے جا سکتے ہیں جو انسان کو ایک نئی زندگی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔تاہم جو باتیں عمومی طور پر کہی گئی ہیں ان سے ایک نئے طریق کار کا احساس ہوتا ہے اور ایک ایسے اثباتی تہذیبی رویے سے آشنائی ہوتی ہے جو عصر

حاضر کے افسانے میں بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ حیدرقریشی نے ان افسانوں کے ذریعے کہانی کے کینوس کو وسیع کرتے ہوئے نئے امکانات کی طرف اشارا کیا ہے اوراس سچائی کو نمایاں کیا ہے کہ Limit Situation کے دوران انسان صرف کرب ہی کی نمائندگی نہیں کرتا اور نہ اس کا وجود ہی پاش پاش ہوتا ہے بلکہ اس کے نطق سے اس کی اپنی تاریخ گفتگو کرتی ہے۔ ہمارا افسانہ تاریخ کے اس مکالمے سے شاید اب تک غافل تھا۔ حیدرقریشی نے اپنے افسانوں کی راہ سے تاریخ کے اس مکالمے کو سننے کی سعی کی ہے۔

میں نے حیدرقریشی کے افسانوں کے مرکزی رجحان کو واضح کرتے ہوئے ان کہانیوں کا ذکر نہیں کیا جن میں دانستہ روشنی کو روپوش کیا گیا ہے۔ ایسی کہانیاں جو اس مجموعے میں دوتین سے زیادہ نہیں ہیں دراصل حیدرقریشی کے افسانوں کی دنیا کا پس منظر ترتیب دیتی ہیں۔ اوراس پس منظر کی تلخ صورت ہی سے وہ کیفیت رونما ہوتی ہے جو حیدرقریشی کے افسانوں کو ان کا مزاج فراہم کرتی ہے۔ حیدرقریشی کے افسانے ایک نئے طریقے سے قاری تک پہنچتے ہیں اوران کی گفتگو کا لہجہ بھی مختلف ہے۔ اس اعتبار سے ان افسانوں میں ایک ایسا رویہ بھی شامل ہے جو کہانی سنتے ہوئے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ کہ کہانی محض کسی واقعے ہی کی بات نہیں کرتے بلکہ اس سچائی کا ذکر بھی کرتی ہے جو واقعیت کے رگ وریشے میں جاگتی ہے اور سب سے کہتی ہے کہ مجھے پہچانو۔ میں کون ہوں؟

سچائی نے ہمارے زمانے میں افسانے کا لباس پہن رکھا ہے!

☆☆☆

میں انتظار کرتا ہوں!

خزاں رسیدہ سہی پھر بھی میں اگر چاہوں
جہاں نگاہ کروں اک نئی بہار اُگے

میں سوتیلے جذبوں کے عذابوں سے گزرتا ہوں کہ مجھے اپنا سفر مکمل کرنا ہے۔
میں کسی صحرا میں پیاس کی شدّت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔
اور مامتا کی ماری میری ماں پانی کی تلاش میں ہلکان ہوتی پھر رہی ہے۔
میں کسی اندھے کنوئیں میں گرا پڑا ہوں۔
اور میرے بھائی ان سوداگروں سے بھی میری قیمت وصول کر رہے ہیں جو کچھ دیر بعد مجھے اس کنوئیں سے نکالیں گے اور غلام بنا کر لے جائیں گے۔
میں کسی جنگل میں بَن باس کے دن گزار رہا ہوں۔
مری بیوی مجھے ہرن کا شکار لانے کے لیے کہتی ہے۔ میں ہچکچاتا ہوں مجھے معلوم ہے اس کے بعد کیا ہوگا مگر پھر میں بیوی کی خواہش پوری کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔

☆☆

میں کہ سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔
میری تاریخ کے سفر کا ایک حصہ مکمل ہو گیا ہے ’’لچھمن ریکھا‘‘ عبور ہوتے ہی تاریخ کے سفر کا دوسرا حصہ شروع ہوگیا ہے۔ میں کسی غیبی امداد کا منتظر ہوں۔

میں اندھے کنوئیں سے نکال لیا گیا ہوں۔

مگر میں ابھی تک اندھے کنوئیں میں ہوں کہ زلیخا میرے تعاقب میں ہے اور میں گناہ کے اندھے کنوئیں سے نکلنے کے لئے مسلسل دوڑ رہا ہوں۔

پیاس کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

اور میری ماں جو دوڑتے دوڑتے تھک کر چُور ہو گئی ہے۔ ابھی تک پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے اس کے اپنے ہونٹوں پر پیاس کی پپڑیاں جم گئی ہیں۔ مگر دور دور تک کسی قافلے کے آثار نظر نہیں آتے۔

میری بے گناہی۔۔۔ میری نیکیاں دنیا نہیں دیکھتی اور میں تہمتوں کی زد میں ہوں۔

میں اذیت میں ہوں کہ میری ماں ابھی تک میری خاطر پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

وہ جو بادشاہ زادی ہے۔ میرے سوتیلے بھائی اسے لونڈی اور مجھے لونڈی کا بیٹا کہتے ہیں۔

میں دکھ میں ہوں کہ حاکم کی بدکار بیوی مجھے میری نیکی کی کڑی سزا دلواتی ہے۔

میں قید میں ہوں کہ بدکاری کی تہمت مجھ پر عائد کر دی گئی ہے۔

اور میرا سینہ تنگ ہوتا ہے کہ میری پاک دامن بیوی پر بدکاری کا الزام عائد کیا گیا ہے۔

یہ سارے جھوٹے الزام اور تہمتیں وہی لگا رہے ہیں جو خود بدکار ہیں۔ جو میرے سوتیلے عزیز ہیں۔

وہ میرے گرد سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کا ایندھن جمع کر رہے ہیں تاکہ اس میں نفرتوں کی آگ لگا کر مجھے بھسم کر ڈالیں۔

میں اس آگ سے بچنے کے لئے دعا کرتا ہوں کہ میں بے حد کمزور ہوں۔

☆☆

میں وہی ہوں کنواریاں جس کے لیے ہزاروں برس سے انتظار کر رہی تھیں۔

اور میں وہی ہوں..... چاند، سورج اور ستارے جس کے آگے سجدہ ریز ہوں گے۔

اور میں وہی ہوں جو اپنے باپ کے تخت کا حقیقی وارث ہے۔

مگر میں سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔

میں سوچتا ہوں۔

میں کن امتحانوں آزمائشوں اور ابتلاؤں سے گزر رہا ہوں؟

میری پاکدامن بیوی کی صفائی کون دے کہ میرا واسطہ بدکاروں سے ہے جو اپنی برائیاں چھپانے کے لئے دوسروں پر تہمتیں عائد کرتے ہیں۔

اور میری اپنی صفائی کون دے کہ میں اب بھی گناہ پر آمادہ ہو جاؤں تو وہی عورت میری بے گناہی کی گواہی دے کر مجھے چھڑا لے جائے گی جس نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔

اور میری ماں.... بادشاہ زادی.... جو میری حالت نہیں دیکھ سکتی اور اس کی بے قراری دیکھ کر میرا اپنا دِل خون ہوتا ہے اور میں پہلے سے زیادہ زور کے ساتھ ایڑیاں رگڑنے لگتا ہوں، وہ کب تک پانی کی تلاش میں پہاڑیوں کا سفر کرتی رہے گی۔

☆☆

سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کا ایندھن میرے چاروں طرف جمع کیا جا چکا ہے اس ایندھن کے انبار پہاڑوں کی بلندیوں تک پہنچتے ہیں۔

وہ صحرا جس میں، میں ابھی تک پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں اور میری ماں پانی کی تلاش میں چکراتی پھر رہی ہے،

اور وہ اندھا کنواں جس میں مجھے ڈالا گیا تھا اور وہ جیل جس میں، میں اس وقت قید ہوں،

اور وہ جنگل جس میں مجھے اپنے بن باس کے سارے دن گزارنے ہیں،

سب اس ایندھن کے حصار میں آ گئے ہیں۔ ایندھن کے اس حصار کی دوسری طرف میرے سوتیلے عزیز جشن منا رہے ہیں، میری تضحیک کر رہے ہیں، قہقہے برسا رہے ہیں۔ اور وہ لمحہ قریب آتا جا رہا ہے جب وہ اس ایندھن میں نفرت کی آگ لگائیں گے۔ آگ چاروں طرف پھیل جائے گی۔

تب یہ صحرا، یہ اندھا کنواں، یہ جنگل اور میں ... میری بے گناہی اور سچائی کے سارے نشان اس آگ میں جل کر فنا ہو جائیں گے۔ مٹ جائیں گے۔ اور میرے سوتیلے عزیزوں کے سوتیلے جذبوں کے ظلم کا کوئی ثبوت باقی نہیں رہے گا۔ تب میرے سوتیلے عزیز اپنی مرضی کے مطابق میری

تاریخ لکھیں گے، تب وہ اطمینان سے لکھیں گے کہ:
میں بدکار تھا اور میری بیوی بھی بدکار تھی اور میری ماں لونڈی تھی...مگر میرا باپ؟

☆☆

میں پھر سوچنے لگتا ہوں

میں جو صحرا میں پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں۔ابراہیم کا بیٹا ہوں۔

اور میں جو جرم بے گناہی میں قید بھگت رہا ہوں، ابراہیم کا پوتا ہوں۔

اور میں جو جنگل میں بن باس کے دن کاٹ رہا ہوں۔میں بھی ابراہیم کی آل سے ہوں کہ سچ کی راہ پر چلنے والے اور ظلم کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے والے ابراہیم کی آل میں شمار ہوتے ہیں۔

میں وہی ہوں کنواریاں جس کے لئے ہزاروں برسوں سے انتظار کر رہی تھیں۔

اور میں وہی ہوں۔۔چاند سورج اور ستارے جس کے آگے سجدہ ریز ہوں گے۔

اور میں وہی ہوں جو اپنے باپ کے تخت کا حقیقی وارث ہے۔

میں سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔

میرے سوتیلے عزیز تاریخ کو جتنا مسخ کر لیں مگر وہ میرے باپ کا نام کیوں کر مٹا سکیں گے۔کہ پھر وہ خود بھی بے شناخت ہو جائیں گے۔

میں ابراہیم کا بیٹا ہوں۔

میں ابراہیم کا پوتا ہوں۔

میں آل ابراہیم سے ہوں۔

آگ ابراہیم کے لئے گلزار ہو گئی تھی تو مجھے کیونکر نقصان پہنچا سکے گی۔

''آگ سے ہمیں مت ڈراؤ یہ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی بھی غلام ہے۔''

یہ آسمانی آواز مجھے یقین دلاتی ہے کہ میری ایڑیوں کی رگڑ سے ایک چشمہ پھوٹ بہے گا اور اس کا پانی میری مدد کو آئے گا۔

مجھے جس اندھے کنوئیں میں گرایا گیا تھا آسمان سے اس میں اتنا پانی اترے گا کہ وہ کنواں چھلک

پڑے گا اور بحر ہند کا ٹھاٹھیں مارتا پانی سیلاب بن جائے گا۔

اور پھر سوتیلے جذبوں سے جھوٹے الزامات اور تہمتوں کے ایندھن میں بھڑکائی ہوئی نفرتوں کی ساری آگ بجھ جائے گی۔

☆☆

میرے سوتیلے عزیزوں نے نفرت کی آگ لگا دی ہے۔اس آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔میرے چاروں طرف آگ پھیلی ہوئی ہے۔۔۔سوتیلے جذبوں کی آگ.....مگر میں دیکھتا ہوں کہ:

میرے بن باس کے دن ختم ہو چکے ہیں۔میرا حق میرا تخت مجھے مل گیا ہے اور میری بیوی کی پاک دامنی کی شہادت خود تاریخ دے رہی ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ:

میری قید کی مدت ختم ہو گئی ہے۔اور میں ایک اعلیٰ منصب پر سرفراز کیا گیا ہوں۔اور چاند سورج اور ستارے میرے حضور سجدہ ریز ہیں۔

اور میں دیکھتا ہوں کہ:

تپتے ہوئے صحرا میں میرے ایڑیاں رگڑنے سے ایک چشمہ پھوٹ بہا ہے۔مری ماں کے چہرے پر خوشیوں اور مسرتوں کا نور پھیلا ہوا ہے۔ وہ جو کسی قافلے کی امداد کی منتظر تھی اب ہزاروں قافلے اس کی مدد کے محتاج ہیں۔اور اس بادشاہ زادی کو ایک نئی بادشاہت مل گئی ہے۔اور ہزاروں برس سے میرا انتظار کرنے والی کنواریاں، میرے گلے میں ڈالنے کے لئے اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار سجائے میری آمد کے گیت گا رہی ہیں۔

اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ بحر ہند کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا پانی، آسمان سے اندھے کنوئیں میں اتر کر اور پھر باہر چھلک جانے والا پانی اور میری ایڑیوں کی رگڑ سے پھوٹ بہنے والے چشمے کا پانی.....سب میری آنکھوں میں اتر آئے ہیں۔

سوتیلے جذبوں سے بھڑکائی ہوئی نفرتوں کی آگ بجھتی جا رہی ہے اور اس آگ کے دوسری طرف

میرے تمام سوتیلے عزیز حیرت اور خوف سے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔
میں آگ کے مکمل طور پر بجھنے کا انتظار کرتا ہوں۔
میں انتظار کرتا ہوں جب تھوڑی دیر بعد میرے سارے سوتیلے عزیز مجرموں کی طرح میرے سامنے پیش ہوں گے۔
اور میں اس وقت کے آنے سے پہلے ہی اپنا فیصلہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔

”لا تثریب علیکم الیوم.....“☆

☆ترجمہ: آج کے دن تم سے کوئی مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔

☆☆☆

گلاب شہزادے کی کہانی

ہوا شہکار جب اس کا مکمل
وہ اپنے خون میں ڈوبا ہوا تھا

بے انت پھیلے ہوئے صحرا میں جب رات کا ایک پہر گزرنے کے باوجود کسی کو نیند نہ آئی تو چاروں درویش اٹھ کر بیٹھ گئے۔ پہلے درویش نے تجویز پیش کی کہ رات کاٹنے کے لئے اپنی اپنی کوئی کہانی سنائی جائے۔سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور پہلے درویش سے کہا کہ وہ خود اپنی زندگی کی کسی کہانی سے ابتدا کرے۔
لمبے بالوں والا پہلا درویش آگے کو جھکا اور پھر یوں گویا ہوا:
”میری کہانی گلاب شہزادے کی کہانی ہے۔
گلابی رنگ کو تم بخوبی پہچانتے ہو۔خون سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔خون میں سفید رنگ ملا دیں تو وہ گلابی بن جاتا ہے لیکن اگر خون ویسے ہی کہیں جم جائے تو سیاہ ہو جاتا ہے۔خیر تو میں کہہ رہا تھا..
میری کہانی گلاب شہزادے کی کہانی ہے۔لیکن اس کے لئے مجھے عملاً بتانا پڑے گا“
یہ کہہ کر پہلے درویش نے اپنے تھیلے سے گلاب کی ایک قلم نکالی اور اسے ریت میں گاڑ دیا۔
”میری کہانی کا باقی حصہ اس قلم کے بڑھنے تک ادھورا رہے گا۔اس لئے بہتر ہے کہ آپ لوگ باری باری اپنی کہانیاں سنالیں.....میں آخر میں اپنی کہانی مکمل کروں گا۔“
پہلے درویش کی اس بات پر دوسرے درویش نے اپنی کہانی شروع کی:

''میری کہانی عام سی ہے۔میری بیوی نے اپنی آنکھوں کے جادو اور ہونٹوں کے منتر سے مجھے گدھا بنا دیا تھا اور میں کئی صدیوں سے بوجھ اٹھاتا چلا آ رہا تھا۔پھر ایک دن مجھے بھی ایک اسم مل گیا۔میں گدھے سے انسان بن گیا اور تب میں نے اپنے اسم کے زور سے اپنی بیوی کو گھوڑی میں تبدیل کر دیا۔''

تیسرا اور چوتھا.....دونوں درویش اس کی کہانی بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے جبکہ پہلا درویش گلاب کی اس قلم کو دیکھ رہا تھا جس کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے کانٹے سے چپکے ہوئے تھے.....قلم آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

''اب مجھے صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ پھر میں نے اسے تانگے میں جوت دیا تھا،گھوڑ دوڑ کے کلب میں لے گیا تھا یا ویسے ہی اسے سرپٹ دوڑاتا رہا.... یا پھر پتہ نہیں وہ خود ہی سرپٹ دوڑتی رہی.... دوڑتی رہی......''

''پھر کیا ہوا؟''

تیسرے اور چوتھے درویش نے بڑے اشتیاق اور تجسس سے پوچھا۔

پہلا درویش ابھی تک گلاب کی اس بڑھتی ہوئی قلم کو دیکھ رہا تھا۔

''پھر؟'' دوسرے درویش نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیا۔

''پھر.....جب میری بیوی اپنی پہلی تنخواہ لائی تھی تو اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔اس نے اپنی آدھی تنخواہ گھر کے اخراجات میں ڈال دی اور بقیہ آدھی بچوں کے مستقبل کے لئے بنک میں جمع کرا دی اور پھر ہمیشہ ہی اس کا یہی طریق رہا۔میری اور اس کی تنخواہ سے ہمارا گھر خاصا خوشحال ہو گیا۔البتہ وہ اپنے باس کی بہت تعریفیں کرتی رہتی تھی۔ وہ اس کا ضرورت سے زیادہ ہی خیال رکھتے تھے''۔

اچانک دوسرے درویش کی نظر گلاب کی اس قلم پر پڑی جو اس عرصے میں حیرت انگیز طور پر دوگنی ہو چکی تھی اور اب اس میں ننھے ننھے سبز پتے بھی پھوٹ رہے تھے۔اسے یوں لگا جیسے کانٹوں میں لپٹی ہوئی گلاب کی پوری قلم کسی نے اس کے حلق میں ٹھونس دی ہو۔

اس نے ایک جھرجھری سی لی اور پھر بے اختیار پکارا۔''پانی.....!''

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔

گلاب کی قلم کچھ اور سرسبز ہو گئی اور سبز پتوں کے ساتھ ایک سرخ پتہ بھی ابھر آیا دوسرے درویش نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور دم توڑ دیا۔

باقی تینوں درویشوں نے دیکھا کہ بے انت پھیلے ہوئے صحرا نے خود کو خاصا سمیٹ لیا ہے۔

رات کا دوسرا پہر گزر چکا تھا

تیسرے درویش نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی کہانی شروع کی:

''جیسا کہ آپ جانتے ہیں تاریخ اور جغرافیے سے مجھے گہری دلچسپی ہے اور مرا تعلق بھی آثار قدیمہ سے ہے.....تین بچوں کی پیدائش کے بعد میری بیوی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کروں۔ چنانچہ میں نے غبارے استعمال کرنا شروع کر دیئے....مرا گھر خاصا چھوٹا اور تنگ سا ہے۔کئی دفعہ ایسا ہوا کہ استعمال کے بعد میں نے غبارہ نالی میں پھینکنے کی بجائے کونے میں پڑی بڑی میز کے پیچھے پھینک دیا۔میز کے نیچے پڑے ڈھیر سارے کباڑ میں وہ غبارہ چھپا رہتا۔ پھر کبھی خیال آتا تو اسے اٹھا کر نالی میں پھینک دیتا۔''

چوتھا درویش اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''ایک دفعہ کسی کھنڈر سے کئی ہزار سالہ پرانی کھوپڑی دریافت ہوئی تو اس کے مطالعہ کے لئے مجھے بلایا گیا۔کھوپڑی کے مطالعہ کے بعد جب میں گھر آیا تو اپنی میز کے نیچے کباڑ میں سے کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے مجھے ایک سوکھا ہوا مڑا تڑا سا غبارہ مل گیا۔میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا.... یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کھوپڑی اس غبارے میں موجود ہو اور وہ کھوپڑی مرے اپنے بیٹے کی ہو۔''

چوتھا درویش اس کی کہانی میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔

پہلا درویش گلاب کی اس مسلسل بڑھتی ہوئی قلم کو دیکھ رہا تھا جس میں سے اب شاخیں بھی پھوٹنے

لگی تھیں۔

''میں خوف سے کانپ اٹھا۔ مجھے لگا میں نے اپنے بیٹے کو قتل کر کے اس کے سر کو محض کھوپڑی بنا دیا ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو اپنا خوف بتایا۔ پہلے تو اس نے شور مچا دیا ''خاندانی منصوبہ بندی ختم نہیں کرنے دوں گی۔ مری صحت پھر تباہ ہو جائے گی'' لیکن بالآخر مرا خوف اس کی ضد پر غالب آ گیا۔

جس دن اس نے مجھے خوشخبری سنائی.... مجھے یوں لگا جیسے ہزاروں برس پہلے کھو جانے والی مری کوئی قیمتی چیز مجھے دوبارہ ملنے والی ہے۔''

تیسرے درویش کی نظر گلاب کی اس قلم کی طرف اٹھ گئی جو اَب گلاب کے چھوٹے سے پودے میں ڈھل گئی تھی۔

اسے یوں لگا جیسے گلاب کا پودا اس کے اندر ہے اور کوئی اُسے اُس کے حلق سے باہر کھینچ رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ خوف سے چلّایا: ''پانی....!''

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔

گلاب کا پودا کچھ اور پھیل گیا اس کے سبز پتوں میں ایک اور سرخ پتہ ابھر آیا۔

تیسرے درویش نے خوفزدہ آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور دم توڑ دیا۔

باقی دونوں درویشوں نے دیکھا کے بے انت پھیلے ہوئی صحرا نے خود کو آدھا سمیٹ لیا ہے رات کا تیسرا پہر گزر چکا تھا۔

چوتھے درویش نے مشکوک نظروں سے پہلے درویش کو دیکھا اور قدرے چوکنّا ہو کر اپنی کہانی بیان کرنے لگا:

''یہ کہانی دراصل مری نہیں۔ مرے ایک دوست کی ہے۔ میں اسے اسی کی زبان میں بیان کروں گا''

چوتھے درویش نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''مرا بھائی گہری نیند سویا ہوا تھا میں اس کے کمرے میں بیٹھا کوئی کام کر رہا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ مرے بھائی کی ناک سے شہد کی ایک مکھی نکلی.....قریب ہی پانی کا ایک ٹب پڑا تھا۔ جس میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تیر رہا تھا جو شاید کسی بچّے نے ڈال دیا تھا....شہد کی مکھی اڑ کر لکڑی کے اُس ٹکڑے پر جا بیٹھی۔ کچھ دیر بعد پھر اُڑی اور مرے بھائی کی ناک میں داخل ہو گئی.....میں یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا''۔

''اچھا۔ پھر کیا ہوا؟؟'' پہلے درویش کی مسکراہٹ بڑی سفّاک تھی، وہ اب بھی گلاب کے اُس پودے کو دیکھ رہا تھا جو مسلسل پھلتا پھولتا جا رہا تھا۔

''پھر۔۔پھر۔۔'' چوتھا درویش خوفزدہ انداز میں ادھر اُدھر دیکھ کر بولا:

''پھر میرا بھائی بیدار ہو گیا۔ اس نے اپنا ایک حیرت انگیز خواب سنایا....اس نے بتایا کہ وہ کسی دریا کے کنارے کھڑا تھا کہ لکڑی کا ایک بڑا سا تختہ تیرتا ہوا اس کے قدموں میں آ گیا، وہ اس پر سوار ہو گیا۔ جب وہ تختہ اسے دوسرے کنارے پر لے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ جگہ خزانوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر وہ اکیلا یہ خزانے نہ اٹھا سکتا تھا، اس لئے دوسرے ساتھیوں کو لینے کے لئے واپس آ گیا۔''

''حیرت ہے.....حیرت ہے!'' پہلا درویش بڑے مکّارانہ انداز میں بولا۔ اس کی نظریں اب بھی گلاب کے اس پودے پر گڑی تھیں جو اَب بڑی شان سے لہلہا رہا تھا، چوتھا درویش گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا:

''میں بھائی کا خواب سمجھ گیا۔ میں نے اسے قتل کر دیا اور وہ جگہ جہاں ٹب پڑا تھا اور شہد کی مکھی لکڑی کے ٹکڑے پر تیرتی رہی تھی، اسے کھود ڈالا...وہاں واقعی خزانے تھے...مگر....مگر......''

''مگر کیا؟'' پہلے درویش کے لہجے میں تشویش کی ہلکی سی پرچھائیں ابھری۔

چوتھے درویش کی نظریں اس لہلہاتے ہوئے گلاب کے پودے پر پڑیں۔

اور پھر وہی کیفیت.....

''پانی.....!''

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔مگر چوتھے درویش نے کوزہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ پانی پیا۔

پھر گلاب کے پودے میں ایک اور سرخ پتے کو ابھرتے ہوئے دیکھا۔

خوف سے جھرجھری لی۔

''مگر کیا.....؟'' پہلے درویش نے اسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

''مگر..... یہ کہانی مرے دوست کی نہیں.....مری اپنی ہے.....اپنی.....'' اور پھر چوتھے درویش نے بھی دم توڑ دیا۔

سارے صحرا نے خود کو سمیٹ کر پہلے درویش کے قدموں میں ڈال دیا۔

رات کا آخری پہر گزر چکا تھا۔

پو پھوٹ رہی تھی۔

پہلے درویش کے وحشیانہ قہقہے صحرا میں گونجنے لگے۔

''ہاہاہا.....اب اس صحرائی علاقے کی تیل کی دولت کا میں تنہا مالک ہوں۔ ایٹمی جنگ میں جتنے لوگ بھی بچ گئے ہوں گے سب مری رعایا ہیں.....اور میں اس نئے عہد کا حکمران.....عظیم حکمران..... ہاہاہا.....''

اچانک اسے شدید پیاس کا احساس ہوا۔ اس نے کوزے کو دیکھا۔ کوزہ خالی ہو چکا تھا۔وہ گھبرا گیا۔اور پھر پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔

وہ دوڑتا رہا.....دوڑتا رہا.....

اور سمٹا ہوا صحرا پھیلتا رہا.....پھیلتا رہا.....

سورج نصف النہار تک پہنچ گیا۔

اس کے سامنے تیل کے چشموں کا ذخیرہ تھا، کنوؤں کی بجائے چشمے!

مگر پانی؟۔۔۔۔۔

پیاس کی شدّت،

شدید تھکاوٹ،

اور مسلسل پھیلتا ہوا صحرا،

وہ تیل کے چشمے پر ہی پیاس بجھانے کے لئے جھک گیا۔

☆☆

اس کا آدھا جسم باہر پڑا تھا۔سر پانی کے چشمے میں ڈوبا ہوا تھا۔پھیلی ہوئی بانہیں آدھی سے زیادہ چشمے میں اور باقی باہر اور..... لمبے لمبے بال پانی میں لہراتے تیر رہے تھے۔

اس کی مردہ آنکھیں بھی پانی کے چشمے کو تیل کا چشمہ سمجھ رہی تھیں۔

گلاب کے پودے پر ایک بڑا سا پھول اُگ آیا تھا۔

گلاب کے اس پھول کا رنگ غیر معمولی حد تک گہرا سیاہ تھا۔

گلاب شہزادے کی کہانی مکمل ہو چکی تھی۔

مگر نہ کوئی اسے سنانے والا تھا، نہ سننے والا!

☆☆☆

غریب بادشاہ

جو تجھ کو ملنے سے پہلے بچھڑ گیا حیدؔر
تو کس طرح اسے پانے کی آس رکھتا ہے

''تساں بادشاہ ہوا ساں کوں غریبی''

چلچلاتی دھوپ میں صرف ایک دھوتی میں ملبوس، سجدہ ریز اور دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے، پسینے سے شرابور اس مجہول سے فقیر نے جس انداز میں یہ مصرعہ گاتے ہوئے پڑھا ہے اس کا ایک ایک لفظ اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ میری روح میں اتر گیا ہے۔ میں رک گیا ہوں اور حیرت سے اس مجہول فقیر کو دیکھ کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں اور ایک سرخ نوٹ اس کے جوڑے ہوئے ہاتھوں میں پھنسا دیتا ہوں..... ماہ رخ نے میری اس سخاوت کو حیرت سے دیکھا ہے لیکن بولی کچھ نہیں۔ اس کے قرب سے مجھے لگتا ہے میں سچ مچ کا بادشاہ ہوں۔

☆☆

''میں جب بھی اس شہر میں آتا ہوں یہاں کی کوئی نہ کوئی شے مجھے متاثر کر لیتی ہے، ہلا کر رکھ دیتی ہے''

''مثلاً؟''

''مثلاً..... پہلی بار جب میں آیا تو اپنی فرم کی طرف سے کمرشیل وزٹ پر آیا تھا مگر یہاں تم سے نہ صرف ملاقات ہوگئی بلکہ پہلی ملاقات میں ہی اتنی فرینک نیس ہوگئی جیسے ہم ازل سے ایک دوسرے کے ساتھی ہوں۔''

''ہوں!..... اور اس بار؟''

''اس بار..... اس مجہول فقیر کے گنگناتے ہوئے بول نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے''

''کیا واقعی تم اس سے متاثر ہو گئے ہو؟''

''یقین کرو نہایت عجیب اور انوکھا سرور محسوس کر رہا ہوں۔''

''شاید تمہیں فوک سانگس سے دلچسپی ہے!''

''ہاں شاید یہی وجہ ہو یا شاید.....''

''میں تمہارے لئے اس طرح کے گیتوں کی ایک کیسٹ تیار کروالوں گی لیکن تمہاری اتنی گہری دلچسپی کا آخر کوئی جواز بھی تو ہوگا؟''

میں ماہ رخ کی طرف دیکھتا ہوں وہ پورے انہماک سے میرے جواب کی منتظر ہے۔

''فوک سانگس سے میری دلچسپی کا پس منظر بڑا عجیب سا ہے۔

ایک دفعہ میں اپنے ایک دوست کے ہاں بھٹہ واہن گیا۔ وہاں مجھے پتہ چلا کہ سسّی کی جنم بھومی بھٹہ واہن تھی۔ وہاں کے راجہ کی بیٹی، سسّی جسے راجہ نے نجومیوں کے مشورے کے بعد صندوق میں بند کر کے دریا کے دھاروں کے سپرد کر دیا تھا اور یوں وہ بھٹہ واہن سے بھنبھور پہنچ گئی۔''

میں سسّی کی طرف دیکھتا ہوں وہ پورے انہماک سے اپنی داستان سن رہی ہے:

''وہاں تمہاری پیدائش محل کے جس حصے میں ہوئی تھی اس کے کھنڈر ابھی تک موجود ہیں۔ میں اس جگہ گیا تو میرا دل بھر آیا۔ روشنی کی ایک لکیر میرے اندر سے پھوٹی اور مجھ پر منکشف ہوا کہ میں ہی پنوں تھا۔ جو تمہیں تلاش کرتے ہوئے اس کھنڈر تک پہنچ گیا ہوں لیکن روشنی کی لکیر جو میرے اندر

سے پھوٹی تھی وہ ایک دائرہ بن کر مجھے منور کرنے لگی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ہی پنوں تھا اور میں ہی مجنوں تھا، میں ہی فرہاد تھا اور میں ہی رانجھا تھا، میں ہی کرشن تھا اور میں ہی مہندرا تھا..... میں ہر روپ میں تمہیں ڈھونڈتا تھا اور تمہارے جتنے بھی نام تھے سسّی، لیلیٰ، شیریں، ہیر، رادھا۔ مومل سب ایک تھے اور میرے بھی جتنے نام ہیں سب ایک ہیں....لیکن ہم صدیوں سے ایک دوسرے کی تلاش اور جستجو میں حصے بخرے ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہمارے ہر حصے میں دکھ کی ایک کہانی بنتی چلی جا رہی ہے۔۔۔۔۔''

''بھئی! یہ کیا حماقت ہے؟.....ہم لوگ کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' ماہ رخ کی چہکار نے مجھے جاگتی نیند سے بیدار کر دیا ہے۔ میں بے جان مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا ہوں اور پھر ڈائننگ روم کی طرف چلنے لگتا ہوں۔

کھانے کے دوران ماہ رخ کے پاپا نے کارخانوں کی پیداواری صلاحیت بڑھانے کا مسئلہ چھیڑا تو ماہ رخ نے کہا:

''اس کے لئے مزدور کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ جب تک اسے شرکت کا احساس نہ دلایا جائے گا تب تک کارخانوں کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ نہیں ہوسکتا''

''نوجوانی میں پڑھے لکھے ذہنوں کو سوشلزم کا طلسم متاثر ضرور کرتا ہے، پختگی آنے سے پہلے نوجوان ایسی ہی جوشیلی باتیں کرتے ہیں.....اس بحث سے ہٹ کر دیکھیں تو آج کے مزدوروں کی فطرت کا یہ عالم ہے کہ ان کی دائیں مٹھی میں نوٹ دے دیں تو بایاں ہاتھ آگے کر دیں گے، بائیں ہاتھ کو بھر دیں تو دایاں ہاتھ آگے کر دیں گے۔ جہاں نوٹ ملنے میں اسٹاپ آیا وہیں حق تلفی کے نعرے گونجنے لگیں گے۔''

ماہ رخ کے پاپا کے لفظوں سے ایک منجھے ہوئے کارخانہ دار کی شخصیت اپنی جھلک دکھا رہی تھی ۔

''میرا خیال ہے مل مالکان اور مزدوروں میں فاصلہ ملز انتظامیہ کی بداندیشی سے پیدا ہوتا ہے۔ انتظامیہ کے افسران کی غلط پالیسیاں بھی نفاق کا باعث بنتی ہیں مثلاً میرے اِدارہ کے میرے ایک کولیگ جو ایک دوسرے ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ ہیں ان کی پالیسی یہ ہے کہ مہینے میں ایک دو بار ہر

مزدور کو کسی سبب سے یا بلا سبب جھاڑ ضرور پڑنی چاہئے اس طرح یہ لوگ اپنی اوقات میں رہتے ہیں''

''کتنی گھٹیا ذہنیت ہے ایسے لوگوں کی'' ماہ رخ اس وقت کسی کارخانہ دار کی بیٹی کی بجائے کسی مزدور یونین کی لیڈر لگ رہی تھی... ''برصغیر کی تاریخ میں.....''

لیکن اس سے پہلے کہ مزدوروں اور کارخانہ دار کا مسئلہ کوئی سنگین صورت اختیار کرتا ماہ رخ کے پاپا ہنستے ہوئے معذرت کر کے اٹھ گئے اور برصغیر کی تاریخ کے تذکرے سے بات کا رخ ہندوستانی کلچر اور تہذیب کی طرف مڑ گیا،

''قدیم کلچر آج بھی کسی نہ کسی روپ میں ہمارے ساتھ ہے۔ جذباتی نعرے بازی کر کے اس سے فرار حاصل نہیں ہوسکتا۔ ہماری پیدائش سے لے کر شادی، بیاہ اور مرگ تک کی رسومات پر قدیم ہندوستانی کلچر کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ کھرچنے سے بھی ختم نہ ہو۔''

''یہ ٹھیک ہے۔لیکن اب ہماری اپنی تہذیب کا رنگ جمتا جا رہا ہے، اور ہماری اپنی تہذیب اس سے زیادہ خوبصورت ہے''

''یہ تہذیب بھی اس کلچر کے اثرات سے خالی نہیں، کلچر گم نہیں ہوتا بلکہ قدرے مختلف روپ میں پھر سامنے آجاتا ہے۔''

''بابا! اس میں کلچر کا کیا کمال ہے۔ یہ تو دھرتی کا کمال ہے۔جغرافیے کا کمال ہے۔ یہاں کی مٹی۔ یہاں کے دریا، پہاڑ، کھیت، جنگل، آب و ہوا، انہیں سے ہی تمہارے قدیم کلچر کی تشکیل ہوئی تھی اور انہیں عناصر ہی سے ہماری تہذیب بن رہی ہے اس میں جغرافیے کے ساتھ ساتھ ہماری ہسٹری بھی شامل ہوگئی ہے'' اور پھر بحث اس اتفاق پر ختم ہوئی کہ قدیم ہندوستانی کلچر کے ایک مخصوص موضوع ''رسم شادی'' پر ایک تازہ ویڈیو فلم دیکھی جائے۔

☆☆

گھنے جنگل کے درمیان ایک وسیع و عریض میدان،

گہری تاریک رات،

میدان کے ایک سرے پر ایک چبوترے پر قبیلے کا سردار اپنی قبائلی آن بان کے ساتھ براجمان ہے۔اس کے پیچھے، دائیں بائیں جری کمان دار چوکس کھڑے ہیں۔میدان کے وسط میں آگ کا بہت بڑا الاؤ روشن ہے۔سردار کے دائیں، بائیں دونوں اطراف سے لے کر میدان کے دوسرے سرے تک الاؤ کے گرد لوگوں کا ایک دائرہ سا بن گیا ہے، لوگوں نے اپنے سیاہ چہروں پر چکناہٹ مل کر خود کو چمکایا ہوا ہے، ڈھولک کی تھاپ گونجتی ہے اور پھر گونجتی ہی چلی جاتی ہے۔ پھر اس تھاپ کے ساتھ ایک عجیب سا ساز اُبھرتا ہے۔مجھے لگتا ہے میں اس ساز سے واقف ہوں لیکن کچھ یاد نہیں پڑتا۔عجیب سا ساز ہے، ایک لمحے روح کی پاتال تک اتر جاتا ہے اور دوسرے لمحے میں خوفزدہ کر دیتا ہے۔مسرت اور خوف کی عجیب سی کشمکش.....اچانک قبیلے کے سردار کی پاٹ دار آواز گونجتی ہے اور ڈھولک اور ساز کی آواز قدرے مدھم ہو جاتی ہے۔سردار نے پتہ نہیں کیا کہا ہے۔ایک نوجوان لڑکی شرمائی شرمائی سی، اپنے ہاتھ میں موتیوں کی مالا لئے آگے بڑھنے لگتی ہے۔

قبیلے کے سردار نے پھر کچھ کہا ہے اور اب دو نوجوان لڑکے ایک ساتھ آگے بڑھ آئے ہیں۔ ڈھولک کی تھاپ اور اس مانوس سے ساز کی آواز ایک دم تیز ہو جاتی ہے۔جلتے ہوئے الاؤ کی سرخ زبانیں کچھ اور لمبی ہوگئی ہیں۔وہ نوجوان لڑکی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان نوجوانوں کی طرف بڑھ رہی ہے...اب وہ دونوں کے روبرو کھڑی ہے۔دونوں نوجوانوں کے اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کے سانس نیچے رک گئے ہیں....ڈھولک کی تھاپ اور اس ساز کی آواز کچھ اور تیز ہو جاتی ہے۔

اور پھر...لڑکی نے ایک نوجوان کے گلے میں ہار ڈال دیا۔

مجھے پتہ نہیں کیا ہوا، میں نے تیزی سے اٹھ کر وی سی آر کا سوئچ آف کر دیا۔

''یہ کیا؟''ماہ رخ نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''بس۔اب آگے اس ہار جانے والے نوجوان کا حال نہیں دیکھا جائے گا۔بے چارہ!''

''اس میں بے چارگی کی کیا بات ہے۔قدیم ترین زمانوں میں تو لڑکی کے سارے امیدوار لڑتے تھے، ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے۔جو آخر میں فتح یاب ہوتا تھا وہ شادی کا حق دار بنتا تھا۔یہ تو اس زمانے کے بعد کی فلم ہے''

☆☆

ماہ رخ کے پاپا کی فیکٹری سے متعلق ہمارے ادارے کا کام آج مکمل ہو گیا ہے اور آج ہی میرا واپسی کا ارادہ ہے تاہم میں نے طے کیا ہے کہ جانے سے پہلے ماہ رخ سے شادی کے مسئلہ پر بات کر ہی لوں۔ہماری دوستی جتنی تیزی سے بڑھی ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہمیں رشتۂ از دواج میں منسلک ہو جانا چاہیے۔یوں بھی آج صبح سے ہی ماہ رخ خاصے خوشگوار موڈ میں ہے۔ اس پیش کش سے اس کا خوشگوار موڈ رومینٹک بھی ہو جائے گا۔

''کیا تمہیں پتہ ہے میں اپنے مذہبی تہوار منانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے مذہبی تہوار بھی اسی عقیدت اور احترام کے ساتھ مناتی ہوں۔کرسمس، بیساکھی، دیوالی......''

''یہ بڑی اچھی بات ہے اگر ساری قومیں اسی طرح ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے لگیں تو دنیا میں مذہب کے نام پر کبھی کوئی فتنہ فساد پیدا نہ ہو''

''آج کا دن میرے لئے دوہری خوشی لایا ہے۔ایک تو یہ کہ آج بھی ایک تہوار ہے اور دوسری یہ کہ آج ہم ایک مقدس رشتے میں منسلک ہونے کا اقرار کریں گے''

(مقدس رشتے کی بات سن کر میرا دل مارے خوشی کے دھڑکنا بھول گیا ہے، واقعی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔میں نے آج خود ماہ رخ سے رشتے کی بات چھیڑنی تھی مگر میرے بات کرنے سے پہلے وہ خود یہی بات طے کر چکی ہے)

''میں نے کئی نوجوان دیکھے ہیں مگر کوئی بھی میرے معیار پر پورا نہیں اُترا۔تم پہلے نوجوان ہو جس کی آنکھوں کی سچائی کو میرے دل نے تسلیم کیا ہے اور جو صحیح معنوں میں میرے کڑے معیار پر پورا اُترا ہے''

(میرے انگ انگ میں مسرّت بھر گئی ہے)

''میں نے ابھی ڈیڈی سے بات کی تھی وہ بھی میرے انتخاب پر بے حد خوش ہیں''

(مسرّت میرے انگ انگ میں لبالب بھرنے کے بعد اب ندی کے دھاروں کی طرح چھلکنے لگ گئی ہے)

''لاؤ اپنا ہاتھ اِدھر لاؤ''

میں نے آنکھیں موند کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا ہے۔ بے خودی اور سرشاری کی کیفیتیں مجھے شرابور کر رہی ہیں۔

''آج کے دن بہنیں اپنے بھائیوں کو راکھی باندھتی ہیں۔ میرا کوئی بھائی نہیں جسے میں راکھی باندھتی لیکن آج میری زندگی کا یہ ادھورا پن ختم ہو رہا ہے''

میرے دل، دماغ اور سماعت پر سینکڑوں ایٹم بم گر گئے ہیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھتا ہوں تو آنکھوں پر بھی ہزاروں ایٹم بم گر گئے ہیں۔ اس نے مجھے راکھی کے بندھن میں باندھ لیا ہے،،

میرے اندر ایک گھنا جنگل اُگ آیا ہے اور جنگل کے درمیان ایک وسیع میدان میں (میرے سینے کے عین وسط میں) آگ کا ایک بہت بڑا الاؤ روشن ہے۔ سارا قبیلہ جمع ہے۔ ڈھولک کی تھاپ تیز ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس ساز کی آواز بھی تیز ہو جاتی ہے جو ایک لمحے میں روح کی پاتال تک اُتر جاتا ہے اور دوسرے لمحے میں خوفزدہ کر دیتا ہے، میں اس ساز کو اب پوری طرح جان گیا ہوں سب کچھ یاد آ گیا ہے۔ لڑکی نے موتیوں کا ہار دوسرے نوجوان کے گلے میں ڈال دیا ہے، میں اپنی شکست کا منظر نہیں دیکھنا چاہتا مگر اب وی سی آر کا سوئچ تو نہیں جسے آف کر کے فرار ممکن ہو سکتا ہے۔ میرے اندر اور باہر میری شکست کے منظر ہیں۔

ماہ رخ نے سچ کہا تھا'' کلچر گم نہیں ہوتا بلکہ قدرے مختلف روپ میں پھر سامنے آ جاتا ہے''

☆☆

چلچلاتی دھوپ میں صرف ایک دھوتی میں ملبوس، سجدہ ریز اور دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف اُٹھائے ہوئے، پسینے سے شرابور وہ مجہول فقیر اب بھی وہی مصرعہ گاتا چلا جا رہا ہے:

''تساں بادشاہ ہو اساں کوں غریبی''

میں نے پرس میں صرف واپسی کے کرائے کے پیسے رکھے ہیں اور جیبوں تک سے نکال کر سارے چھوٹے بڑے نوٹ اس فقیر کو دے دیئے ہیں۔

ماہ رخ نے تعجب سے مجھے دیکھ کر پوچھا ہے''یہ کیا؟''

''صرف واپسی کا کرایا''

''تساں بادشاہ ہو اساں کوں غریبی''

اس عارفانہ کلام کی ایک نئی معنویت مجھ پر آشکار ہوتی ہے، ماہ رخ کے قرب سے میں اب بھی خود کو بادشاہ محسوس کرتا ہوں مگر غریب بادشاہ!

☆☆☆

دُھند کا سفر

کسی کا جھوٹ جب اس عہد کی سچائی کہلایا
ہمارا سچ تو خود ہی موردِ الزام ہونا تھا

''گاڑی ٹھہرانا مقصود ہوتو زنجیر کھینچئے۔
بلاوجہ زنجیر کھینچنے والے کو پچاس روپے جرمانہ ہوگا۔''

میں ٹرین کے ڈبے میں لکھی یہ تحریر حیرت سے پڑھتا ہوں اور اس کے اوپر لٹکی ہوئی زنجیر کو دیکھتا ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ زنجیر کھینچنے سے یہ گاڑی کیسے رک سکتی ہے۔

آپی اپنی سیٹ پر بیٹھی ٹانگیں ہلا رہی ہے۔

بلو ساتھ والی مسافر خواتین کو مختلف چیزیں کھاتا دیکھ کر امی کو مخاطب کرتی ہے اور پھر ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔

''امی.... ہیں ہیں ہیں''

امّی اسے گھورتی ہیں مگر ڈھائی سال کی بچی کو کیا پتہ کہ ماں کیوں گھور رہی ہے۔ امی نے اپنے ساتھ موجود بڑے سے تھیلے سے کھانے کی کچھ چیزیں نکال کر بلو اور آپی کو دی ہیں۔ آپی میرے حصے کی چیز لا کر مجھے دینے لگتی ہے۔

دو سال پہلے کی بات ہے جب ہم چار سال اور تین سال کے تھے۔ تایا جی ہمارے ہاں

آئے تھے۔ پھر تھوڑی دیر کے لئے کہیں باہر چلے گئے تو آپی نے اور میں نے مشترکہ طور پر سوچا کہ ہمارے تایا جی گم ہو گئے ہیں اور پھر صلاح کی کہ ہم دونوں چل کر انہیں ڈھونڈتے ہیں۔ ہم بڑی خاموشی سے گھر سے نکل آئے۔ قریبی بازار تک آئے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ راستے گم ہونے لگے اور تایا جی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم خود گھر کا راستہ بھول گئے، نہ تایا جی ملے نہ گھر کا راستہ۔ سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر ہم دونوں نے رونا شروع کر دیا۔ کسی شریف دوکاندر نے ہمیں اپنی دوکان پر بٹھا لیا اور ڈھیر ساری مٹھائی بھی ہمارے سامنے رکھ دی۔ ہم نے مٹھائی کھانے کے ساتھ رونے کا عمل بھی جاری رکھا تاوقتیکہ تایا جی اور ابا جی ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں تک نہ آ گئے۔ تب ہم مارے خوشی کے باقی مٹھائی اٹھانا بھی بھول گئے۔

''بھائی! یہ لو نا اپنی چیز۔'' آپی کی آواز میں جھنجھلاہٹ ہے اور میں چونک اٹھتا ہوں۔

''جی۔ ہاں۔ آں۔'' میں اپنے حصے کی چیز لیتا ہوں اور پھر اسے وہ زنجیر اور اس کے نیچے لکھی تحریر دکھاتا ہوں وہ بھی حیران ہوتی ہے مگر اس طرح ڈر کر امی کے پاس بھاگ جاتی ہے، جیسے اس کے دیکھنے سے ہی زنجیر کھنچ جائے گی اور گاڑی رک جائے گی.... بلو اپنے حصے کی چیز کھا کر پھر ان خواتین کی طرف دیکھتی ہے جو مسلسل کچھ نہ کچھ کھائے جاری ہیں اور پھر ''امی..... ہیں ہیں ہیں'' کی گردان شروع کر دیتی ہے۔ امی پھر تھیلے میں ہاتھ ڈالتی ہیں۔

میں ان خواتین کی طرف دیکھتا ہوں۔ ان میں سے ایک بے حد خوبصورت عورت مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی ہے۔ مجھے عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی نگاہوں سے سورج کی کرنیں میری جسم پر اترنے لگتی ہیں اور میں جیسے ایک دم جوان ہونے لگتا ہوں۔ پانچ سے دس، دس سے پندرہ، پندرہ سے بیس اور بیس سے پچیس۔ اب میں پچیس سال کا بھرپور جوان ہو گیا ہوں۔ مگر گاڑی کا سارا منظر بدل چکا ہے۔ زنانہ ڈبہ کی بجائے مردانہ ڈبہ ہو گیا ہے۔ میرے پاس سیٹ بھی نہیں ہے۔ فرش پر اکڑوں ہو کر بیٹھا ہوں اور سارے فرش پر بھی اتنا رش ہے کہ بیٹھے بیٹھے پہلو بدلنا مشکل ہے۔

ایک اسٹیشن پر مسافروں کا ایک بڑا تیز ریلا اندر آتا ہے۔ چھوٹے سے اسٹیشن پر اتنے مسافر!.....

شاید کوئی بارات ہو۔! گاڑی چلتی ہے تو مسافروں کے اوسان بحال ہونے لگتے ہیں۔ایک مسافر نے ٹرین کے چیکر کو ایک ایسی گالی دی ہے کہ میرے چودہ طبق روشن ہوگئے ہیں۔ دوچار اور مسافروں نے بھی ایسی ہی گالیاں دیں تو پتہ چلا سارے بے چارے فرسٹ کلاس کے فرش پر بیٹھے تھے۔ سب سے دس دس روپے جرمانہ وصول کرکے بغیر رسید کے سب کو اس ڈبے میں دھکیل دیا گیا ہے۔

گالیوں کا سلسلہ بڑھنے لگتا ہے۔

گالیاں ریلوے کے مختلف افسران سے ہوتی ہوئی ریلوے کے چیئر مین تک پہنچ چکی ہیں۔

پھر وزیر ریلوے بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ بالکل میرے قریب بیٹھے ہوئے ایک ''یک چشم'' داڑھی والے نے دانت پیستے ہوئے بابائے قوم کو بھی گالی دے دی ہے۔

میں سنّاٹے میں آگیا ہوں۔

اس کی بدزبانی پر کوئی احتجاجی آواز بھی نہیں ابھری۔

مجھے لگتا ہے ہم سب زمین میں دھنستے جارہے ہیں۔

گردن تک ہم زمین میں دھنس گئے ہیں۔

میرے اندر کا وہ پانچ سالہ بچہ نکل کر زنجیر کے پاس جا کھڑا ہوا ہے اور میرے اشارے کا منتظر ہے۔

میں اس یک چشم داڑھی والے کو سخت لعن طعن کرتا ہوں۔

''بابائے قوم کا کیا قصور؟ یہی کہ اس نے تمہیں آزادی دلائی ہے..... میں لمبی چوڑی تقریر کرتا ہوں۔مگر وہ یک چشم داڑھی والا بڑی متانت سے پھر وہی گالی بابائے قوم کا نام لے کر دہراتا ہے۔

آخر میں اپنے اندر کے اس پانچ سالہ بچے کو اشارہ کرتا ہوں کہ وہ زنجیر کھینچ دے۔مگر اس دوران ہی ایک بے حد خوبصورت خاتون سے اس کی آنکھیں چار ہوتی ہیں اور وہ جوان ہونے لگتا ہے۔ پہلے وہ زنجیر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اب اس خوبصورت خاتون کو حیرت سے دیکھ رہا ہے۔ میں خود آگے بڑھ کر زنجیر کھینچ دیتا ہوں۔

''اس خبیث کو ابھی گرفتار کراتا ہوں۔ذلیل انسان بابائے قوم کے دیس میں بابائے قوم کو گالیاں دیتا ہے۔''

گاڑی رک گئی ہے۔ ریلوے گارڈ، ٹکٹ چیکر اور کچھ پولیس والے آچکے ہیں۔ میں انہیں بتاتا ہوں کہ اس ذلیل شخص نے بابائے قوم کی شان میں گستاخی کی ہے۔مگر شاید ریلوے کے عملہ کو میری بات سمجھ نہیں آتی۔گارڈ اور چیکر میری بات سے جھلا گئے ہیں۔

اور پھر چیکر میرے جرمانے کی رسید کاٹنے لگتا ہے۔

پچاس روپے جرمانہ ادا کرتے ہوئے میرے ہونٹوں پر وہی گالی مچلتی ہے جو اس سے پہلے وہ یک چشم داڑھی والا بابائے قوم کے خلاف بکتا رہا تھا۔مگر میں گالی کو ہونٹوں پر اترنے سے پہلے ہی روک لیتا ہوں۔ پتہ نہیں بابائے قوم کے احترام کے باعث یا ان پولیس والوں کے باعث جو ریلوے گارڈ اور ٹکٹ چیکر کے ساتھ کھڑے ہیں۔

اتنا ضرور ہے کہ میں ایک دم چھوٹا ہوتا جارہا ہوں اور گھٹتے گھٹتے ایک نقطے میں ڈھل گیا ہوں۔زنجیر کے نیچے کھڑا پانچ سالہ ''میں'' پھر حیرت سے اس تحریر کو پڑھ رہا ہوں۔

''گاڑی ٹھہرانا مقصود ہو تو زنجیر کھینچئے
بلاوجہ زنجیر کھینچنے والے کو پچاس روپے جرمانہ ہوگا''

بلو اپنے حصہ کی چیز کھا کر پھر ''امی.... ہیں ہیں ہیں'' کی گردان کر رہی ہے۔

آپی میرے حصے کی چیز لے کر پھر مجھے دے رہی ہے۔

مگر میں اب دانستہ آپی کی بات نہیں سن رہا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے اس کے بعد ہی میری نظر اس خوبصورت خاتون کی طرف اٹھ جائے گی جو بڑی دیر سے مجھے دیکھ رہی ہے اور پھر.....اور پھر....

میں خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور بند آنکھوں سے ہی پڑھنے لگتا ہوں:

''گاڑی ٹھہرانا مقصود ہو تو زنجیر کھینچئے
بلاوجہ زنجیر کھینچنے والے کو پچاس روپے جرمانہ ہوگا۔''

☆☆☆

آپ بیتی

اپنی کچھ نیکیاں لکھنے کے لئے بھی حیدؔر
اپنے ناکردہ گناہوں سے سیاہی مانگوں

(۱)

اس دن ماں نے مجھے معمول کے مطابق فجر کے وقت جگایا تھا مگر اس کا لہجہ معمول کے مطابق نہ تھا۔ میں نے تاروں کی روشنی میں ماں کی آنکھوں میں تشویش جھلکتی دیکھی۔ ماں مشرق کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں گہری سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا آسمان پر شفق پھوٹنے کی بجائے خون پھوٹ بہا ہے۔

اس دن سارا شہر خوفزدہ تھا لوگوں کی نظریں اخبارات کی خبروں پر جم کر رہ گئیں۔

ٹریفک کے حادثے میں بیس افراد ہلاک اور تیس شدید زخمی۔

ملزمان پندرہ روز تک مجھے مسلسل بے آبرو کرتے رہے۔ برآمد کی جانے والی مغویہ کا بیان۔

ایک نوجوان نے محبت میں ناکام ہو کر محبوبہ کو ہلاک کر دیا۔

سگے باپ، بھائی اور بھابھی کو قتل کر دیا، خانگی جھگڑے کا شاخسانہ۔

ساری خبریں معمول کے مطابق تھیں مگر اس دن یہ ساری خبریں غیر معمولی لگ رہی تھیں۔ لگتا تھا ہر خبر کا آسمان کی سرخی سے کوئی تعلق بنتا ہے۔

اس دن شہر میں بہت سی بھڑیں آ گئی تھیں۔ پہلے شہر میں جس طرح مکھیاں بھنبھناتی تھیں اب ویسے ہی بھڑیں اڑتی پھرتی تھیں۔

اس دن شدید گرمی کے باعث میں نے قمیص اتار رکھی تھی اور بنیان پہنے اپنی کرسی پر بیٹھا اس دن کی ڈاک دیکھ رہا تھا۔ ڈاک میں دیگر خطوط کے ساتھ میری ایک بہت ہی اچھی دوست کا خط بھی تھا۔ جونہی میں اس کا خط پڑھنے لگا مجھے اپنے سینے پر شدید جلن محسوس ہوئی۔ ایک بھڑ نے میرے سینے پر ڈنک مارا تھا۔ میں تکلیف کے عالم میں ماں کے پاس آیا تو اس نے لوہے کی کسی چیز کو ڈنک والی جگہ پر رگڑتے ہوئے دم کیا اور میری تکلیف بڑی حد تک دور ہو گئی پتہ نہیں اس دم کی وجہ سے یا ماں کی وجہ سے یا شاید دونوں کی وجہ سے!

اس دن شام کو غروب آفتاب کے بعد آسمان کی طرف پھر ویسی ہی گہری سرخی چھا گئی اور دن بھر کے پریشان لوگ اور زیادہ خوف زدہ ہو گئے یہ سارے واقعات صرف اس دن ہی غیر معمولی لگے۔ طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب کے بعد اب بھی آسمان گہرا سرخ ہوتا ہے۔ بھڑیں اب بھی شہر میں دندناتی پھرتی ہیں۔ قتل، اغوا، ایکسیڈنٹ اور آبروریزی کے واقعات اب بھی ہوتے ہیں مگر لوگ اب پہلے کی طرح پریشان نہیں ہوتے۔ انہوں نے آسمان کی سرخی کو بھی معمولاتِ زندگی میں شمار کر لیا ہے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ میری ماں کی آنکھوں میں ابھی تک تشویش جھلک رہی ہے۔ وہ اپنی تشویش سے آگاہ کر کے مجھے پریشان نہیں کرنا چاہتی لیکن میں نے راتوں کو دیکھا ہے کہ وہ کئی دفعہ اٹھ اٹھ کر، آسمانی صحیفوں کی دعائیں پڑھ پڑھ کر، مجھے سوتا جان کر مجھ پر دم کرتی رہتی ہے۔ ایک دو دفعہ میں نے سنا وہ میرے باپ سے آہستہ آواز میں اپنی تشویش کا اظہار کر رہی تھی اور میرے باپ نے آسمان کی سرخی کو خدا کی ناراضگی سے تعبیر کرتے ہوئے کہا تھا کہ دنیا پر عنقریب بہت بڑی تباہی آنے والی ہے۔ اپنی ماں اور باپ کی اس تشویش کو دیکھ کر مجھے بھی کبھی کبھی تشویش ہونے لگتی ہے۔

جب پہلے پہل لوگوں نے خوف کا اظہار کیا تھا تب وہ بھی اس آسمانی تبدیلی کو اجتماعی زاویے سے دیکھ رہے تھے اور میرے ماں باپ بھی اسے کسی اجتماعی تباہی کا پیش خیمہ سمجھ رہے

ہیں۔لیکن ماں راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر مجھے کیوں دَم کرتی رہتی ہے؟ اس سوال نے مجھے اس سارے معاملے کو انفرادی زاویے سے دیکھنے کی تحریک کی ہے اور میں آسمان کی سرخی کو اپنی ذات کے حوالے سے سوچنے لگتا ہوں۔

(۲)

''رات دو بجے.....عقبی دروازہ.....ٹھیک!''

میں اس بے ربط مگر معنی خیز تحریر کو پڑھتا ہوں اور اس خوبصورت لڑکی کا سراپا مجھے اپنے پورے وجود میں خوشبو بکھیرتا محسوس ہوتا ہے جو ایک عرصے سے میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ میری ایک بہت ہی اچھی دوست نے مجھے کئی دفعہ اس خوبصورت لڑکی سے لاتعلقی کی نصیحت کی تھی۔ مگر میں نے ہمیشہ اس کی نصیحت کو نظرانداز کیا۔ اور آج جب اس خوبصورت لڑکی نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا ہے تو میرے ذہن میں خود بخود گناہ کا تصوّر ابھرنے لگتا ہے۔ ماں سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے میں بیٹھک میں آ کر بظاہر سو جاتا ہوں۔

اس وقت رات کے آٹھ بجے ہیں اور میں نے لیٹے ہی لیٹے دائیں طرف کروٹ بدل کر خیال ہی خیال میں اس خوبصورت لڑکی کو اپنے پہلو میں سلا لیا ہے۔ میری سانسوں کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ اور عین اس وقت جب میں کلائمکس پر پہنچنے لگا ہوں میں نے اس کا چہرا اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس کے ہونٹوں کا بھرپور بوسہ لینا چاہا ہے.....مگر مجھے جیسے یکدم کرنٹ لگ گیا ہے۔ میرے ہاتھوں میں جو چہرا ہے وہ ہو بہو میری بیٹی کا ہے۔ میری ننھی بچی.....جیسے ایک دم جوان ہو کر میرے ساتھ لیٹی ہو۔ میں خوف زدہ ہو کر بیٹھک سے نکل کر باہر سڑک پر آ جاتا ہوں۔ اور کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگتا ہوں۔

کافی دیر بعد میں دوبارہ اندر آتا ہوں۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔ میں پھر بستر پر لیٹ جاتا ہوں مگر خوف کے باعث اب بائیں کروٹ لیٹتا ہوں۔ لیٹتے ہی وہ خوبصورت لڑکی پھر میرے پہلو میں آ گئی ہے اور.....اور.....نہ چاہتے ہوئے بھی میں پھر اس کے جسم کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اپنے پورے وجود میں سمونے لگتا ہوں۔ اپنے سارے عمل کے دوران میں

شعوری طور پر کوشش کرتا ہوں کہ اس کا چہرہ نہ دیکھوں۔ مگر.....اس نے اپنے ہاتھوں میں میرا چہرہ تھام لیا ہے میں قدرے جھجکتے ہوئے اس کی طرف دیکھتا ہوں۔ یہ چہرہ میری بیوی کا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میری بیوی ایک ماہ سے میکے گئی ہوئی ہے۔ اس کی عدم موجودگی کے باوجود اس کی موجودگی میں کوئی حرج نہیں۔ میں اس کے جسم کو اور بھینچ لیتا ہوں۔ لیکن مجھے پھر کرنٹ لگتا ہے.... میں نے اپنے آپ کو دیکھا تو میری جگہ کوئی اور تھا۔

میں پھر خوفزدہ ہو کر سڑک پر نکل آتا ہوں اور کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لینے لگتا ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آسمان کی خونی سرخی دراصل میرے اس ہونے والے ریپ کی گواہ اور اس خوبصورت لڑکی کے بہنے والے خون کا ثبوت ہے۔ لیکن ہم دونوں میں اصل مجرم کون ہے؟

مری اس اچھی دوست نے ایک دفعہ جھلا کر مجھے کہا تھا'' آپ دونوں ایک دوسرے کے لئے مخلص نہیں ہیں صرف اپنے جذبات کی تسکین کے لئے ایک دوسرے سے فراڈ کر رہے ہیں''.....لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے بڑے بڑے مخلص دوستوں کو بھی ذاتی مفاد کی خاطر انتہائی گھٹیا سطح پر اترتے دیکھا ہے خود میری اس اچھی دوست نے میرے ساتھ زبردست فراڈ کیا ہے۔ ایسا فراڈ جو ابھی تک وہ خوبصورت لڑکی بھی میرے ساتھ نہیں کر سکی۔

☆☆☆

عشق کے روایتی قصوں میں ایسے واقعات ضرور ملتے ہیں مگر رات کو کسی سے چوری چھپے ملنے جانا میری زندگی کا پہلا تجربہ ہے۔ گہری سیاہ رات میں پکڑے جانے کا کوئی خوف نہیں لیکن جب میں اس کے دروازے پر ہلکی سی دستک دینے لگتا ہوں تو اچانک روشنی میں نہا جاتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے سارا شہر میرے تعاقب میں نکل آیا ہے اور میں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہوں۔ میں گھبرا کر چاروں طرف دیکھتا ہوں۔ میرے چاروں طرف گھور اندھیرا ہے، پھر میں کس روشنی میں نہا گیا ہوں؟ کہیں یہ مرے اندر کی روشنی تو نہیں؟.....مرے شجرے کی روشنی؟

دروازہ کھل گیا ہے اور میں اپنے سوالوں کے جواب سوچے بغیر اندر داخل ہو گیا ہوں۔ کمرے میں صرف ایک چارپائی اور ایک کرسی پڑی ہے، لیکن ہم دونوں چارپائی پر ایک ساتھ بیٹھتے ہیں۔

اس نے اپنی کمر کا بوجھ مرے اس بازو پر ڈال رکھا ہے جو میں نے اس کی کمر میں حمائل کر رکھا ہے۔ گپ شپ کرتے ہوئے اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری بیوی اور میری بیٹی دونوں میرے دائیں بائیں آن کھڑی ہیں۔ وہ دونوں مجھے میرے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیتی ہیں، سامنے میری وہ اچھی دوست اپنا منہ دوسری طرف پھیرے کھڑی ہے۔ میں عین موقعہ پر پکڑ لئے جانے کی شرمندگی کے ساتھ باہر آنے لگتا ہوں۔ وہ خوبصورت لڑکی مجھے حیرت سے دیکھتی ہے۔

واپس آ کر میں ٹائم دیکھتا ہوں۔ تین بج رہے ہیں۔ بستر پر لیٹتے ہی مجھے گہری نیند آ جاتی ہے.....

ماں حسبِ معمول فجر کے وقت مجھے جگاتی ہے تو میں بمشکل آنکھیں کھول پاتا ہوں۔ ماں کے چہرے پر فکرمندی کے گہرے اثرات ہیں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں مجھے بتاتی ہے کہ آج آسمان پہلے سے بھی زیادہ سرخ ہے۔ میں کمرے سے باہر نکل کر آسمان کی طرف دیکھتا ہوں اور پھر حیرت سے ماں کا چہرہ تکنے لگتا ہوں۔

''ماں! آج تو آسمان پر معمولی سرخی بھی نہیں ہے۔ بالکل صاف آسمان ہے''

ماں مجھے تشویشناک نظروں سے دیکھتی ہے اور پھر غالباً مجھ پر دَم کرنے کے لئے کوئی آیت پڑھنے لگتی ہے....میں کمرے میں آ کر بڑے آئینے کے سامنے اپنے بال درست کرنے لگتا ہوں، بال درست کرتے ہوئے مجھے اپنی آنکھیں لال انگاروں کی طرح نظر آتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے آسمان کی ساری سرخی مری آنکھوں میں اتر آئی ہے۔ میں نے انفرادی زاویے سے آسمانی سرخی کا بھید پالیا ہے.... ماں کمرے میں آ کر مجھ پر پھونکیں مارتی ہے، مجھے لگتا ہے وہ کہنا چاہتی ہے کہ مجھے تمہارے رات کے سارے عمل کا پتہ ہے لیکن پھر میرے شرمندہ ہونے کا خیال کر کے چپ چاپ لوٹ جاتی ہے۔ میں وضو کرنے کے لئے باہر آنے لگتا ہوں تو ایک کتاب پر ایک بھڑ کو بیٹھا دیکھتا ہوں....ایک دوسری کتاب اٹھا کر میں نے اس بھڑ پر دے ماری ہے اور اسے اس کے ڈنک سمیت ختم کر دیا ہے....اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی اس اچھی دوست کا خیال آ جاتا ہے جس کی ایک زیادتی کے باعث میں اس سے ناراض ہوں۔

ممکن ہے وہ بھی اپنی زیادتی پر نادم ہو اور اس ندامت کا احساس آسمان کی ساری سرخی اس

کی آنکھوں میں بھی بھر دے....ممکن ہے آج شام کو غروبِ آفتاب کے بعد مری طرح اسے بھی آسمان خون آلود نظر نہ آئے اور وہ بھی میری طرح انفرادی زاویے سے آسمان کی سرخی کا بھید جان لے....اور ممکن ہے وہ بھی کسی بھڑ کو اس کے ڈنک سمیت مار دے۔

میں اس خوبصورت لڑکی کے بارے میں بھی کچھ سوچنا چاہتا ہوں لیکن فی الحال میں طے کرتا ہوں کہ آج ناشتے کے بعد تازہ اخبار کا مطالعہ نہیں کروں گا۔ قتل، اغوا، زنا، ایکسیڈنٹ کی خبریں تو روز کا معمول ہیں۔ آج میں ناشتے کے بعد اپنی اس اچھی دوست کا خط پڑھوں گا جس سے میں ناراض ہوں۔

وہی خط جسے پڑھتے وقت بھڑ نے میرے سینے پر ڈنک مارا تھا۔

☆☆☆

ایک کافر کہانی

صوفی، سادھو بن کر تیری کھوج میں ایسے نکلیں
خود ہی اپنا رستہ، منزل اور سفر ہو جائیں

بڑی عجیب اذیّت ہے۔ میں نماز پڑھتا ہوں، رکوع تک تو نماز ٹھیک رہتی ہے لیکن سجدے میں کہیں اور پہنچ جاتا ہوں۔ اسٹین گن اٹھائے مکروہ تکونے چہرے اور نحوست برساتی آنکھوں والا ایک شخص میرے روبرو آجاتا ہے۔ میں سجدے میں خدا کو ڈھونڈتا ہوں۔ وہ کہتا ہے: ''میں تمہیں خدا تک نہیں پہنچنے دوں گا''

میں سوچتا ہوں شاید خدا بھی اس کے سامنے بے بس ہوگیا ہے لیکن یہ کافرانہ خیال آتے ہی سجدے سے سر اٹھالیتا ہوں۔

مجھے ابراہیم ادھم رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ یاد آتا ہے جب وہ ہر قدم پر سجدے کرتے ہوئے چودہ سال کی مسافت طے کر کے مکہ پہنچے تو کعبہ اپنے مقام پر موجود نہ تھا۔ تب غیب سے آواز آئی تھی۔

''کعبہ ایک ضعیفہ کے استقبال کے لئے گیا ہے جو ادھر آرہی ہے۔

آپ پکار اٹھے کہ وہ کون ہے؟....اتنے میں دیکھا کہ رابعہ بصریؒ عصا ٹیکتی ہوئی آرہی ہیں۔ پھر کعبہ بھی اپنے اصلی مقام پر آگیا۔''*1

لیکن مجھے تو سجدے میں وہی مکروہ تکونے چہرے اور نحوست برساتی آنکھوں والا اسٹین گن اٹھائے نظر آتا ہے، تنگ آکر میں جنگل کی طرف نکل جاتا ہوں اور اپنے اندر ہی اندر سفر کر کے ایک بزرگ سے ملتا ہوں اور انہیں اپنا روگ بتاتا ہوں۔ ان کے چہرے پر نورانی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے وہ کہتے ہیں:

''میں سو سال محراب میں رہا اور اپنے تیئں حیض والی عورت کی طرح جانتا تھا''*2

''تو کیا میں بھی حیض کی کیفیت میں ہوں؟'' میرے سوال کے جواب میں بزرگ کے چہرے پر اثباتی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اب میں ان سے تعارف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے ''سبحانی ما اعظم شانی''*3 کہا تو میں چونک اٹھتا ہوں۔ کہیں یہ بزرگ حضرت بایزید بسطامیؒ تو نہیں؟۔۔ میں ان سے سوال کرتا ہوں۔

''عرش کیا ہے؟''

فرمایا ''میں ہوں۔''

''لوح وقلم کیا ہے؟''

فرمایا ''میں ہوں۔''

''ابراہیم، موسیٰ، محمد علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں؟''

فرمایا ''میں ہی ہوں''

''اللہ کے بندے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل علیہم السلام کے سے بھی ہیں؟''

فرمایا ''میں ہوں''

میں خاموش ہوجاتا ہوں۔

تب فرمایا:

''جو شخص حق میں محو ہوجاتا ہے اور جو کچھ ہے حق ہے اگر ایسی صورت میں وہ سب کچھ ہو تو کوئی تعجب نہیں۔''*4

مجھے یقین ہوجاتا ہے کہ یہ بزرگ حضرت بایزید بسطامی ہیں۔ میں نے ان کے ہاتھوں

کو چوما اور کہا: ''قیامت کے دن ساری خلقت محمّدیؐ جھنڈے تلے جمع ہوگی''

فرمایا: ''محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام اس سے زیادہ ہیں۔ خلقت میرے جھنڈے تلے کھڑی ہوگی۔'' *5

میں فرطِ عقیدت سے انہیں لپٹ جاتا ہوں اور اپنی شفاعت کے لئے ان کی منّت کرتا ہوں لیکن تب ہی یکا یک وہ بھی غائب ہوگئے اور میں بھی غائب ہوگیا۔ اب پتہ نہیں میری جگہ کون ہے کیوں کہ یہ بہر حال میں نہیں ہوں۔ اب میں جو بھی ہوں ابھی تک یہی جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں کون ہوں۔

یکا یک دیکھتا ہوں کہ:

''میں ماسوائے اللہ سے زائد ہوگیا پھر جب میں نے اپنے آپ کو بلایا تو حق تعالیٰ سے آواز آئی میں نے خیال کیا کہ اب میں خلقت سے آگے بڑھ گیا ہوں۔ میں **لبیک اللھم لبیک** کہتے ہوئے محرم ہوگیا پھر تسبیح کرنے لگا اور وحدانیت میں جب طواف کرنے لگا تو بیت المعمور نے میری زیارت کی، کعبہ نے میری تسبیح پڑھی، ملائکہ نے میری تعریف کی۔ پھر ایک نور نمودار ہوا جس میں حق تعالیٰ کا مقام تھا۔ جب اس مقام میں پہنچا تو میری ملکیت میں کوئی بھی چیز نہ رہی۔'' *6

اور پھر میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ:

''کبھی تو میں اُس کا ابوالحسن ہوں اور کبھی وہ ابوالحسن ہے۔ یعنی جب میں فنا ہوتا ہوں تو میں وہ ہوتا ہوں''۔ *7

یکا یک ایک مرقع پوش ہوا سے اُترتا ہے اور زمین پر پاؤں مارتے ہوئے کہتا ہے:

''میں جنیدؒ وقت ہوں
میں شبلیؒ وقت ہوں
میں بایزیدؒ وقت ہوں''

میں بھی اٹھ کر رقص کرنے لگتا ہوں

''میں خدائے وقت ہوں
مصطفائے وقت ہوں'' *8

بہت سے لوگ میرے گرد جمع ہوجاتے ہیں۔ یہ سب نجات کے طالب ہیں۔ میں انہیں کہتا ہوں ''جاؤ فلاں قبرستان میں دفن ہوجاؤ تمہاری نجات ہوجائے گی۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''

نجات کے ایک طالب نے پورے خلوص سے اپنے شک کا اظہار کیا ہے۔

''تمہیں خبر نہیں کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ بعض قبرستان ایسے ہوں گے کہ ان کے چاروں کونے پکڑ کر انہیں بغیر حساب کے بہشت میں ڈال دیں گے۔ ان میں سے ایک بقیع بھی ہے'' *9

میرا جواب سن کر شک کا اظہار کرنے والا کہتا ہے ''یہ کافر ہے اسے سنگسار کردو۔''

ایک اور کہتا ہے ''یہ بایزید بنتا ہے۔''

ایک اور بولتا ہے ''ابوالحسن خرقانی بنتا ہے۔''

تب ان سارے نجات کے طالبوں نے اپنے ہاتھوں میں پتھر اٹھائے تاکہ مجھے سنگسار کر کے نجات پالیں۔ میں نے پتھروں کے ڈھیر میں دبے ہوئے دیکھا: ''میں بایزید اور اویس قرنی ایک ہی کفن میں تھے'' *10

پھر میں اپنے اندر سے باہر نکلتا ہوں اور اپنے آپ کو پہچانتا ہوں اور ان مقدّس ہستیوں کے فیوض اپنے آپ میں محسوس کرتا ہوں۔

لیکن جب نماز پڑھتے ہوئے سجدے میں جاتا ہوں تو وہی مکروہ تکونے چہرے اور نحوست برساتی آنکھوں والا اسی طرح اسٹین گن لئے کھڑا ہے اور اسٹین گن کی طاقت کے نشے میں کہتا ہے۔

''میں تمہیں خدا تک نہیں پہنچنے دونگا۔''

میں اس کی احمقانہ بات پر دل ہی دل میں ہنستا ہوں۔ خدا تو خود مجھ تک پہنچ گیا ہے۔

لیکن پھر یہ مکروہ تکونے چہرے اور نحوست برساتی آنکھوں والا ابھی تک اسٹین گن کیوں اٹھائے کھڑا ہے؟

یہ سوال میں نے پتہ نہیں کس سے کیا ہے؟

اپنے آپ سے یا خدا سے؟
مگر مجھے اپنے سوال کے حتمی اور عملی جواب کا انتظار ہے!

---ماخذ---

''تذکرۃ الاولیاء'' تالیف حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ

اُردو ترجمہ مطبوعہ منزل نقشبندیہ لاہور - ۱۹۲۵ء

☆☆☆

روشنی کی بشارت

بدل جاتے ہیں اک لمحے میں ہی تاریخ کے دھارے
کبھی جو موج میں آ کر قلندر بول اُٹھتے ہیں

''دیوانہ خاموش ہو گیا اور اپنے سامعین کو دیکھنے لگا۔ وہ بھی خاموش تھے اور حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بالآخر اس نے چراغ زمین پر پٹخ دیا جو ریزے ریزے ہو کر بجھ گیا۔ تب اس نے کہا:
''میں بہت پہلے آ گیا ہوں میرا تعلق مستقبل سے ہے۔ یہ مہیب واقعہ ابھی فاصلے ہی طے کر رہا ہے'' **(نطشے کی ایک تمثیل سے اقتباس)**

اپنی آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں کا گواہ، مٹی کا چراغ اپنے ہاتھوں پر اٹھائے جب میں شہر کے لوگوں کو روشنی کی بشارت دیتا ہوں تو وہ مجھے اس انداز سے دیکھتے ہیں جیسے میں ان کے ساتھ مذاق کر رہا ہوں۔ کچھ لوگ میری بات پر ہنستے ہیں۔ کچھ سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے آگے چلے جاتے ہیں۔ کچھ سر اٹھا کر دیکھے بغیر کچھ سوچتے چلے جاتے ہیں۔

میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں کا گواہ مٹی کا چراغ میرے ہاتھوں میں ہے۔ لیکن کوئی بھی میری بشارت پر ایمان نہیں لا رہا۔ مجھے شک گزرتا ہے۔ میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آ گیا ہوں۔ یہ لوگ مجھ سے سولہ سو برس پیچھے ہیں۔ یہ میری بات نہیں سمجھ پائیں گے۔ پھر کچھ سوچ کر میں اپنی ماں کے پاس جاتا ہوں اور روشنی کی بشارت دیتے ہوئے اسے بتاتا ہوں کہ میری

آنکھوں میں سورج طلوع ہورہے ہیں اور میرے ہاتھوں میں مٹی کا یہ چراغ ان کا گواہ ہے۔ میری ماں مجھے تشویشناک نظروں سے دیکھتی ہے اور آسمانی صحیفوں کی دعائیں پڑھ پڑھ کر مجھ پر پھونکوں سے دَم کرنے لگتی ہے۔ میری چھوٹی بہن مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھتی ہے اور دبک کر ماں کے قریب ہوجاتی ہے۔ ماں کی سادگی اور بہن کے بھولپن پر افسردہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے میں مبارکہ کے پاس آتا ہوں اور اسے بتاتا ہوں کہ میں دنیا کو روشنی کی بشارت دینے کے لئے مامور کیا گیا ہوں۔ میری آنکھوں میں سورج طلوع ہورہے ہیں اور میرے ہاتھوں میں مٹی کا یہ چراغ ان کا گواہ ہے۔ مگر وہ میری بات پر توجہ دینے کی بجائے مجھے دوکانداروں کے بلوں اور بچوں کی فیسوں کے بارے میں بتانے لگتی ہے۔ میں مایوس ہوکر عفت کے پاس چلا آتا ہوں۔ پہلے تو وہ میری بات پر توجہ نہیں کرتی لیکن جب میں پوری سنجیدگی سے اپنی بات دہراتے ہوئے اصرار کرتا ہوں کہ اب روشنی صرف میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں سے ہی اترے گی۔ تو وہ میرے قریب آجاتی ہے۔۔ میرے ہاتھوں میں مٹی کے چراغ کو چھوکر دیکھتی ہے اور پھر پوچھتی ہے۔۔ کہیں آپ افسانہ لکھنے کے موڈ میں تو نہیں ہیں؟۔۔ میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔ اس کے باوجود وہ مجھے اسی موضوع پر افسانہ لکھنے کی تحریک کرتی ہے۔

مجھے اب پوری طرح یقین ہوجاتا ہے کہ میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آگیا ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے اس سے پہلے ایک دفعہ میں اپنے وقت سے پچاس برس پہلے آیا تھا اور جب پچاس برس بعد میں دوبارہ آیا تھا تو میں نے یہ دیکھا تھا کہ میں اپنے وقت سے ایک صدی پہلے آگیا ہوں.... پھر جب میں ایک صدی بعد آیا تو میری آمد اپنے وقت سے دوسو سال پہلے تھی۔ اور جب میں دوسو سال بعد آیا تو میری آمد میں چار سو سال رہتے تھے اور پھر جب میں چار سو سال بعد آیا تو میں اپنے وقت سے آٹھ سو سال پہلے آیا ہوا تھا۔ اور اب جب میں آٹھ سو سال بعد آیا ہوں تو مجھے یقین ہوگیا ہے کہ میں اپنے وقت سے سولہ سو سال پہلے آگیا ہوں۔

میں جو روشنی کی بشارت ہوں۔ ہر لحظہ اس دنیا سے دور ہورہا ہوں وہ کون سی صفر مدّت

ہے۔ جس میں یہ تمام صدیاں اور زمانے سمٹ آئیں گے اور میری آمد قبل از وقت نہ ہوگی۔ وہ صفر مدّت جب انسان نور کا انکار کرکے آگ کی بھینٹ نہیں چڑھے گا۔ مجھے اس مدّت کا انتظار کرنا ہوگا۔

اب جب میں سولہ سو برس کے بعد آؤں گا تو میری آمد میں بتیس سو سال رہتے ہوں گے۔ اور جب میں بتیس سو سال بعد آؤں گا تو میری آمد میں چونسٹھ سو سال رہتے ہوں گے۔ اور اسی طرح کئی ہزار برس بیت جائیں گے۔ لیکن وہ صفر مدت کب آئے گی جب میرا آنا بروقت ہوگا۔ اور جب میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورج سوا نیزے کی انی پر آجائیں گے۔ تب کوئی انکار کی جرأت نہ کرسکے گا۔ میں اپنے گزرے ہوئے اور آنے والے برسوں کا بوجھ اپنی روح پر اٹھائے پھر شہر میں آتا ہوں۔ شہر کے سب سے بڑے بازار میں پہنچ کر میں اعلان کرتا ہوں:

''لوگو! تم نے میری بشارت پر ایمان نہ لاکر خود کو روشنی سے محروم کرلیا ہے..''

میرا اعلان مکمل ہونے سے پہلے ہی لوگ تمسخر شروع کردیتے ہیں۔ مختلف سمتوں سے گالیاں اور تضحیک آمیز فقرے میری طرف آرہے ہیں۔ میں کمال ضبط سے تمام تمسخرانہ اور تضحیک آمیز فقرے برداشت کرتا ہوں۔ جب لوگ فقرے بازی سے خود ہی تھک جاتے ہیں تو میں اپنا پہلا اعلان ادھورا چھوڑ کر نیا اعلان کرتا ہوں:

''لوگو! تم نے روشنی کی تحقیر کی ہے۔ نورِ بصیرت سے محروم لوگو! تم میں سے اب صرف وہی لوگ بچائے جائیں گے جو میرے گھر کی دیواروں کی اوٹ میں پناہ لیں گے۔ میں اپنے وقت سے سولہ سو برس پہلے آگیا ہوں لیکن آگ تمہارا مقدر ہوچکی ہے۔''

یہ کہہ کر میں اپنا چراغ شہر کے چوراہے پر توڑ دیتا ہوں اور خود تیزی سے اپنے گھر کی طرف چلا آتا ہوں۔ لوگوں کے قہقہے گھر تک میرا تعاقب کرتے ہیں۔ لیکن میرے گھر پہنچنے تک وہ قہقہے چیخوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ مٹی کے اس چراغ سے سارے شہر میں آگ لگ جاتی ہے۔

میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھ جاتا ہوں۔

سارے شہر میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ اور لوگوں کی چیخیں ایک بھیانک شور

میں تبدیل ہوگئی ہیں میری ماں حیرت سے کبھی میرے کمرے میں آ کر مجھے دیکھتی ہے اور کبھی گھر کے صحن میں جا کر دھڑا دھڑ جلتے ہوئے شہر سے اٹھتے ہوئے شعلوں کو دیکھتی ہے۔ میری چھوٹی بہن اسی طرح خوفزدہ انداز میں ماں کے ساتھ ساتھ ہے۔ پھر وہ ماں کو کھینچ کر میرے کمرے میں بٹھا لیتی ہے اور خود دبک کر ماں کے اور بھی قریب ہو جاتی ہے۔

مبارکہ اور عفت دونوں میرے کمرے میں آتی ہیں۔ دونوں کے چہروں سے حیرت جھلک رہی ہے۔ ایک گھمبیر خاموشی کے بعد مبارکہ ہمت کر کے بولتی ہے،

''باہر بہت سارے لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے آئے ہوئے ہیں''

''اب ان کا ایمان لانا یا نہ لانا ایک برابر ہے...جو لوگ دیواروں کی اوٹ میں ہیں انہیں ویسے بھی کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ میں اب بیعت نہیں لے سکتا۔ میں اب سولہ سو برس کے بعد آؤں گا۔ پھر بتیس سو برس کے بعد پھر چونسٹھ سو برس کے بعد۔۔پھر۔۔''

مبارکہ اور عفت کے چہروں سے عقیدت کے ساتھ دہشت بھی ٹپکنے لگتی ہے۔

میری چھوٹی بہن دبک کر ماں کے کچھ اور قریب ہو جاتی ہے۔

میری ماں اپنی خالی آنکھوں میں ان لمحوں کو اتارنے کی کوشش کر رہی ہے جب اس نے مجھے جنم دیا تھا اور میں اس صفر مدت کا انتظار کرنے لگتا ہوں جب میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورج سوا نیزے کی اَنی پر اتر آئیں گے۔ جب وہ اپنے گواہ آپ ہوں گے اور جب مٹی کا کوئی چراغ گواہی کے لئے نہیں لانا ہوگا۔

☆☆☆

میری ماں اور چھوٹی بہن سامنے بینچ پر بیٹھے ہیں۔ مبارکہ میری نبض دیکھتے ہوئے بتاتی ہے،''ابھی تھوڑی دیر پہلے عفت آپ کی عیادت کے لئے آئی تھی۔ مگر آپ سوئے ہوئے تھے۔ اب وہ پھر تھوڑی دیر بعد آئے گی۔''

اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ میں کس صفر مدت کا انتظار کر رہا ہوں!

☆☆☆

ماما

یہ ساری روشنی حیدؔر ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس قمر میں جو نور خاک میں ہے

میں لان میں کھڑی جہاز کو پرواز کرتے دیکھ رہی ہو۔ اس جہاز میں میری ممی گرمیاں گزارنے سوئٹزرلینڈ جا رہی ہیں۔ ڈیڈی انہیں سی آف کرنے ایئرپورٹ تک گئے ہوئے ہیں۔ زیبی اور روبی بھی ممی کے ساتھ گئی ہیں..... جہاز میری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے اور میں آہستہ آہستہ کوٹھی کے اندر جانے لگتی ہوں۔

ڈرائینگ روم میں آ کر میں صوفے پر ڈھیر ہو گئی ہوں۔

اچانک مجھے آئینے میں ایک خوبصورت سا جہاز پرواز کرتا نظر آتا ہے.....میں تھوڑا غور سے دیکھتی ہوں.....اف فوہ.....(حیرت ہے!) اس میں اس میں.....تو میری امی کی روح پرواز کر رہی ہے۔

''امی آپ نے تو زندگی بھر ہوائی جہاز کا سفر نہیں کیا تھا، پھر موت کے بعد یہ جہاز کا سفر کیسا؟''

میں امی سے پوچھتی ہوں مگر کوئی جواب نہیں ملتا۔

میں ڈرائینگ روم سے نکل کر ڈاڈر کے سینی ٹوریم میں پہنچ گئی ہوں۔

امی کو مختلف انجکشن لگائے جا رہے ہیں۔ ہم سب بہن بھائی ان کے سرہانے کھڑے ہیں اور ڈیڈی۔ (نہیں ڈیڈی نہیں ابو.....ڈیڈی ممی کے ساتھ ہوتے ہیں اور ابو، امی کے ساتھ.....)

ابو کے چہرے سے گہری تشویش جھلک رہی ہے۔ عجیب سے وسوسوں اور اندیشوں میں گھرا ابو کا چہرہ دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ میں ان کے گلے سے لپٹ جاؤں۔ مگر میں نے تو آج تک منہ در منہ کبھی ابو سے کوئی فرمائش تک نہیں کی۔ جو کچھ بھی مانگنا ہوتا امی کی معرفت مانگتی یا پھر چٹ لکھ کر مانگتی.....

پھر میں اتنی جرأت کیسے کرلوں.....میں نے گھبرا کر ابو کے چہرے سے نظریں ہٹالی ہیں اور امی کی طرف دیکھنے لگی ہوں۔ امی کی بجھی بجھی آنکھوں سے میری آنکھیں چار ہوئی ہیں اور میری آنکھوں میں روشنی بھر گئی ہے۔

میں سینی ٹوریم سے واپس ڈرائینگ روم میں آ گئی ہوں۔ آئینے میں اب وہ خوبصورت جہاز نظر نہیں آ رہا۔ ابو.....نہیں ڈیڈی.....ڈیڈی ایئر پورٹ سے واپس آ گئے ہیں۔ میں نے ریٹو کے ابو کو اپنے لاہور خیریت سے پہنچنے کا خط ابھی تک نہیں لکھا۔ اس لئے خط لکھنے بیٹھ گئی ہوں۔

سوئیٹزرلینڈ سے زیبی کا خط آیا ہے۔ وہ بڑے مزے کی سیر کر رہے ہیں ممی نے ڈھیروں پیار بھیجے ہیں۔ آج ڈیڈی بھی ایک ہفتہ کے لئے سوئیٹزرلینڈ جا رہے ہیں۔

ڈیڈی چلے گئے ہیں اور میرے ابو میرے پاس آ گئے ہیں۔

''چلو بیٹی تمہاری امی تمہارا انتظار کر رہی ہو گی''

ڈاڈر کی خوبصورت وادی اور اس میں بہتا ہوا دریائے سرّن کا صاف و شفاف پانی.....یہ منظر سوئٹزرلینڈ کی کسی بھی وادی سے کم نہیں۔ لیکن ابو ان تمام نظاروں سے لاتعلق میرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے سینی ٹوریم کی طرف تیزی سے چل رہے ہیں۔ میں دو تین دفعہ ٹھوکر لگنے کی وجہ سے گرنے لگتی ہوں۔ مگر ابو نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام رکھا ہے اس لئے بچ جاتی ہوں.....ہم امی کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ سارے بہن بھائی وہاں موجود ہیں صرف زیبی نہیں ہے۔

امی پوچھتی ہیں ''زیبی کہاں ہے؟''

ابو خاموش کھڑے ہیں۔ میں کہنا چاہتی ہوں کہ ''سوئٹزرلینڈ گئی ہوئی ہے'' مگر کہہ نہیں سکتی کیونکہ زیبی جو چھوٹی ہونے کی وجہ سے سب کے آخر میں کھڑی تھی بڑھ کر آگے آ جاتی ہے۔

امی کے سرہانے پڑے ہوئے آکسیجن کے سلنڈر دیکھ کر مجھے اپنا دَم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔

ابو کچھ دیر کے لئے ڈاکٹر کے ساتھ باہر جاتے ہیں اور میں پھر ڈیڈی کے ڈرائینگ روم میں واپس آ گئی ہو۔ یہاں ریٹو کے ابو میرے منتظر ہیں۔

''کہاں گئے سب گھر والے؟''

''ممی، زیبی اور روبی دو ماہ کے لئے اور ڈیڈی ایک ہفتہ کے لئے سوئٹزرلینڈ گئے ہیں''

''تمہیں کیوں نہیں ساتھ لے گئے؟'' ریٹو کے ابو کا لہجہ کچھ تیکھا سا ہو جاتا ہے۔

''ایک تو اس لئے کے لاہور سے سوئٹزرلینڈ، شیخوپورہ جتنی دور نہیں ہے۔ دوسرے اس لئے کہ گھر پر بھی تو کسی نے رہنا تھا''

''کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہاری سگی ماں زندہ ہوتی اور تم اسے اس طرح ملنے آتیں تو وہ اگلے دن تمہیں گھر چھوڑ کر کہیں سیر کو چلی جاتی؟''

''دیکھئے مجھے میری ممی کے خلاف نہ بھڑکائیے، وہ بہت اچھی ہیں۔ ہم سب کا بے حد خیال رکھتی ہیں۔ آپ ایسی باتیں کر کے میرے دل میں نفرت پیدا کرنا چاہتے ہیں''

''میں تو تمہارے بھلے کی بات کر رہا ہوں''

''مرد ہمیشہ عورت کو بہکاتا ہے اور پھر اپنی ساری غلطیوں کی ذمہ داری بھی عورت پر ہی ڈال دیتا ہے، اور عورت.....وہ اپنی سادگی کے باعث ہرنا کردہ گناہ کو بھی اپنا گناہ تسلیم کر لیتی ہے۔ آدم اور حوا سے لے کر آج تک یہی ہو رہا ہے.....''

قلم گرنے کی آواز سن کر میں چونک اٹھتی ہوں۔ گرے ہوئے قلم کو اٹھا کر پھر سے ریٹو کے ابو کے خط کا جواب لکھنے بیٹھ جاتی ہوں.....مگر یہ کاغذ پر اب تک کیا لکھتی رہی ہوں؟

ابو۔۔ابو۔۔امی۔۔ابو۔۔ڈیڈی۔۔امی۔۔ممی۔۔ڈیڈی۔

اپنی حماقت پر جھینپ کر پھر ریٹو کے ابو کو ان کے خط کا جواب لکھ رہی ہوں۔

ڈیڈی ایک ہفتہ سوئٹزرلینڈ گزارنے کے بعد واپس آ گئے ہیں۔ آج میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ڈیڈی سے ہر حال میں یہ پوچھ کر رہوں گی کہ امی کی وفات کے بعد بھی آپ ایک عرصہ تک ابو

ہی رہے پھر محض ممی سے شادی کے بعد آپ ڈیڈی کیوں بن گئے؟ آپ پھر سے ابو کیوں نہیں بن جاتے؟.....مگر میں جانتی ہوں کہ میں اتنی جرأت کے ساتھ تو کبھی ابو کے سامنے بھی نہ بول سکی تھی پھر ڈیڈی کے سامنے بولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.....شاید امی اس سوال کا جواب دے سکیں!

یہ سوچ کر میں پھر سینی ٹوریم کی طرف چل پڑی ہوں۔

ابو ابھی تک ڈاکٹر سے کوئی مشورہ کر رہے ہیں۔

میں امی کے کمرے میں داخل ہوتی ہوں۔

امی اٹھ کر بیٹھ گئی ہیں۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ.....مہاتما بدھ کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی ہے۔ ہماری خاموش آنکھیں امی سے سوال کر رہی ہیں۔

امی نے بھیا کے سر پر ہاتھ پھیرا ہے۔ بھیا کی آنکھوں میں آنسو ہیں.....اب رضیہ کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہیں وہ بھی اشکبار ہے۔ اب زیبی کو پیار کیا ہے۔ مگر وہ حیران حیران سی، امی کو دیکھ رہی ہے۔ سب سے آخر میں امی نے مجھے بلایا ہے۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرتی ہیں تو میں ان کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو ننھے ننھے قطرے دیکھتی ہوں۔ راکھ کے ڈھیر میں چنگاریاں!

میں ''امی جی'' کہہ کر ان سے لپٹ جاتی ہوں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ راکھ کے اس ڈھیر میں کتنی حرارت موجود ہے۔ شاید یہ ممتا کی حرارت ہے!

ابو ڈاکٹر سے مشورہ کر کے آ گئے ہیں.....

''تمہاری امی ٹھیک ہوگئی ہیں اب ہم انہیں گھر لے جائیں گے''

''امی ٹھیک ہوگئی ہیں؟''

''امی ٹھیک ہوگئی ہیں؟''

دنیا میں کتنی دفعہ معجزے ہوئے ہیں شاید اس دفعہ بھی کوئی معجزہ ہو جائے۔

ایک سپیشل ویگن آئی ہے۔ امی کو اس میں لٹایا گیا ہے۔ میں نے اپنے زانوؤں پر امی کا سر رکھ لیا ہے۔ باقی سارے بہن بھائی بھی ویگن میں بیٹھ گئے ہیں۔ ویگن ڈاڈر کے پہاڑی علاقے

کے نشیب وفراز سے گزر رہی ہے۔ بلندیوں اور پستیوں کے کتنے چکر لگا رہی ہے۔ ایک جگہ ویگن نے ہچکولا کھایا ہے اور میری چیخیں نکلنے لگتی ہیں لیکن میں انہیں دبا کر صرف سسک کر رہ گئی ہوں۔ معجزوں کی امید ختم ہوگئی ہے، میں امی کی ڈھلکی ہوئی گردن کو سیدھا کرتی ہوں۔

''یہ تمہاری ممی نے تمہارے لئے کچھ تحفے بھجوائے ہیں'' ڈیڈی نے دو خوبصورت سے پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ہے۔

ریٹو نیند سے بیدار ہوگیا ہے میں اس کے لئے دودھ بنانے لگتی ہوں۔ اسے دودھ پلا کر پیکٹ کھولتی ہوں۔ ایک پیکٹ میں میرے اور بچوں کے لئے بے حد قیمتی کپڑے ہیں دوسرے پیکٹ میں بچوں کے لئے کھلونے ہیں۔

''ارے یہ جہاز!'' میں حیرت سے اس کھلونے کو دیکھتی ہوں.....یہ بالکل وہی ڈیزائن ہے جو مجھے آئینے میں نظر آیا تھا، جس میں میری امی کی روح پرواز کر رہی تھی۔ میں پھر صوفے پر اسی زاویے سے جا کر بیٹھ گئی ہوں مگر آئینے میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔ میں اٹھ کر آئینے کے روبرو کھڑی ہوگئی ہوں.....

لیکن یہ کیا.....آئینے میں میری بجائے میری امی کھڑی مسکرا رہی ہیں۔ ٹی بی زدہ امی نہیں۔ خوبصورت اور جوان سی۔۔۔۔ بیماریوں کے روگ پالنے سے پہلے والی امی۔ اس عمر کی امی جب میری عمر بمشکل چھ برس تھی.....

میں چاہتی ہوں پھر سے چھ برس کی بچی بن جاؤں پھر بچوں کی طرح شرارتیں کروں۔ مار کھاؤں، ضد کروں، جھڑکیاں سنوں.....ارے ہاں میں چھ برس کی ہی تو تھی جب میں نے قرآن مجید ختم کر لیا تھا۔ امی کتنی خوش تھیں اُس دن!۔۔سارے خاندان میں امی کا سر اونچا تھا کہ میری ننھی سی بچی نے اتنی چھوٹی عمر میں کلام پاک ختم کر لیا ہے۔ جس دن میری ''آمین'' تھی امی مجھے بار بار چومتی تھیں اور پتہ نہیں کیا کیا پڑھ کر پھونکتی تھیں کہ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔

امی ابو کو ''باؤجی'' کہا کرتی تھیں۔ میں نے بھی ایک بار ریٹو کے ابو کو ''باؤجی'' کہا تھا مگر اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے.....میرے سوچتے سوچتے کتنے برسوں

کا فاصلہ طے ہوگیا ہے۔ آئینے میں اب امی کے خوبصورت اور جوان چہرے کی جگہ نحیف و لاغر چہرے نے لے لی ہے، مگر ٹی بی زدہ امی بھی مسکرا رہی ہیں۔

''امی آپ نے دکھ کے لمحوں کی ہر سانس میں ابو کا ساتھ دیا تھا پھر اب خوشی کے لمحوں میں کیوں منہ موڑ گئی ہیں؟''

''بیٹی! اسے مقدر کہتے ہیں'' امی بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیتی ہیں۔

''امی اگر اسے مقدر کہتے ہیں تو پھر ظلم کسے کہتے ہیں؟''

''مقدر کے آگے ہر کوئی بے بس ہوتا ہے بیٹی!''

''میں ایسے ڈراؤنے مقدر کی آنکھیں پھوڑ دوں گی'' میں چیخ اٹھتی ہوں اور اس کے ساتھ ہی بے دم ہو کر نیچے گر جاتی ہوں۔ امی آئینے سے نکل کر باہر آتی ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر مجھے مسہری پر لٹاتی ہیں اور پھر میری پیشانی پر بوسہ دے کر واپس چلی جاتی ہیں۔ میں مسہری پر لیٹے ہوئے کروٹ بدلتی ہوں۔ پیشانی پر ابھی تک امی کے بوسے کا لمس جاگ رہا ہے۔ سامنے ریٹو، ممی کے بھجوائے ہوئے خوبصورت ہوائی جہاز والے کھلونے سے کھیل رہا ہے۔ ساتھ والے کمرے سے میرے بڑے بچے روفی اور بڑی بچی نزہی کے کیرم کھیلنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ڈیڈی کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور میں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ ڈیڈی کچھ دیر ریٹو کے ابو کے مستقبل کے سلسلے میں باتیں کرتے ہیں اور پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ امی کے بوسے کا لمس ابھی تک محسوس ہو رہا ہے۔ میں امی سے ملنے قبرستان پہنچ جاتی ہوں۔ امی کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر ابو کو تلاش کرتی ہوں۔ وہ یقیناً یہیں کہیں مجاور بن کر بیٹھے ہوں گے۔ شاید یہیں کہیں ہوں۔

میں زور سے پکارتی ہوں ''ابو.....ابو''

دوسری طرف کھڑے پہاڑوں سے ٹکرا کر میری آواز گونجتی ہے ''ابو.....وو.....ابو.....''

میں پھر پکارتی ہوں،

پہاڑوں سے ٹکرا کر صدا پھر گونجتی ہے۔

''ابو مجھے تھام لو میں گرنے لگی ہوں''

''ابو مجھے تھام لو میں گرنے لگی ہوں.....ں ں.....ں ں''

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اب اپنے ابو کو نہیں پکار رہی بلکہ پہاڑوں سے سر ٹکرا رہی ہوں۔ میں پہاڑوں کو پاش پاش کر دینا چاہتی ہوں،

''ابو.....ابو.....''

''ابو.....ابو.....وو''

میں چیختے چیختے بے دم ہو گئی ہوں۔ پہاڑوں سے ٹکراتے ٹکراتے ریزہ ریزہ ہو گئی ہوں۔

میں ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں۔ مگر پہاڑ اپنی جگہ قائم کھڑے ہیں۔

''امی آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مقدر کے آگے ہر کوئی بے بس ہوتا ہے۔ امی آپ ٹھیک کہتی ہیں.....امی.....امی.....امی ابو.....'' میں بالکل بکھر کر رہ گئی ہوں۔

اچانک مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی میرے ریزوں کو جمع کر کے مجھے جوڑ رہا ہے۔ اس نے مجھے پھر سے جوڑ دیا ہے۔ اب وہ مجھے اپنے مضبوط بازوؤں پر اٹھائے قبرستان سے باہر نکل رہا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے ''ابو'' آ گئے ہیں۔ اور وہی مجھے اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔

میں آنکھیں کھول کر دیکھتی ہوں ''اف فوہ.....یہ تو ریٹو کے ابو ہیں''

☆☆☆

مجھے شدید بخار ہو گیا ہے۔ ڈیڈی کو ایک اہم میٹنگ میں شرکت کرنا تھی اس لئے وہ جا چکے ہیں۔ میں نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی ہوں۔ اسی عالم میں دیکھتی ہوں تو حیران رہ جاتی ہوں۔ میری ممی میرے سرہانے بیٹھی ہیں۔ انہوں نے اپنے زانوؤں پر میرا سر رکھا ہوا ہے اور بڑے پیار سے مرا سر دبا رہی ہیں۔ مجھے اپنے خیالات پر شدید ندامت محسوس ہوتی ہے۔ میں لفظوں کو جمع کر رہی ہوں:

''ممی.....آپ تو.....ممی.....اچھی سی.....'' لیکن لفظ صحیح طور پر جمع ہی نہیں ہو پا رہے۔ میرے چہرے پر دو گرم گرم آنسو گرتے ہیں (ممی رو بھی رہی ہیں) میں جذبات کو قابو میں رکھے ہوئے ہوں۔

میں اپنی آنکھیں نہیں کھولنا چاہتی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میرے سرہانے تو میری ننھی بچی نز ہی بیٹھی ہے۔ پھر بھی میں لفظوں کو جمع کرنے کی کوشش کر رہی ہوں،

''ممی.....میری اچھی ممی.....مجھے معاف کر دیں.....''

☆☆☆

اندھی روشنی

کب تلک چھائی رہے گی یونہی اندھی روشنی
کب تلک حیدرؔ رہیں گے ان اندھیروں کے عذاب

اندر داخل ہوتے ہی میری آنکھیں چندھیا کر رہ گئی ہیں۔ ہر طرف روشنی کا سیلاب پھیلا ہوا ہے۔ دیواروں پر بڑے بڑے آئینے نصب ہیں جو روشنی کے سیلاب کی شدت میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔ میں نے عجیب سے خوفزدہ انداز میں اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اندھا ہو گیا ہوں۔ جب بینائی کام نہ کرے تو اندھے پن کا احساس قدرتی بات ہے مگر میری تو آنکھیں بھی بالکل ٹھیک ہیں، ان کی بینائی بھی قائم ہے پھر مجھے اندھے پن کا احساس کیوں ہو رہا ہے؟

وہ ایک میز پر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی ہے اور مجھے بھی بیٹھنے کے لئے کہہ رہی ہے۔ مجھے اپنی کرسی بھی نظر آ رہی ہے مگر اندھے پن کا احساس بھی بدستور موجود ہے۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا ہوں اور اب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہا ہوں۔

ہال میں اچانک موسیقی کا ایک شور سا اٹھا ہے۔ عجیب بے ہنگم سی موسیقی ہے۔ سارا ہال اس کی لے پر تھرک رہا ہے۔

وہ میری طرف دیکھتی ہے اور پھر مجھے جیسے گھسیٹتے ہوئے ہال کے وسط میں لے آتی ہے۔ یہاں اور

بھی کئی جوڑے ناچ رہے ہیں اور اب میں بھی اس کے اشاروں پر ناچ رہا ہوں۔لیکن ''میں'' تو ابھی تک اُس کرسی پر گم سم بیٹھا ہوا ہوں بلکہ ''میں'' نے کرسی کے بازوؤں کو اس طرح مضبوطی سے تھام رکھا ہے جیسے انہیں چھوڑ دیا تو ہوا میں اُڑ جاؤں گا۔یا کسی بھیڑ میں گم ہو جاؤں گا، غالباً میں اندھیروں کا باسی ہوں اور شاید اسی لئے روشنی کے اس سیلاب میں ڈبکیاں کھا رہا ہوں.....میرے حواس کھو گئے ہیں...... مجھے اپنا دَم گھٹتا محسوس ہو رہا ہے.....اب کرسی بھی ہچکولے کھا رہی ہے، جیسے اس نے بھی مجھے اس سیلاب میں ڈوبنے سے بچانے سے انکار کر دیا ہو۔میرے چاروں طرف دائرے سے ناچ رہے ہیں۔

موسیقی کا شور بڑھ گیا ہے۔

دائروں کے رقص کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔روشنیوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی ہے اور میرے اندھے پن میں کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں کسی تاریک غار میں دوڑتا جا رہا ہوں۔ہزاروں آسیب میرے تعاقب میں ہیں،اچانک مجھے ٹھوکر سی لگتی ہے۔

''دیکھو احتیاط کرو۔میرا مذاق نہ بناؤ''

اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا ہے۔میں غار سے نکل کر واپس ہال میں پہنچ گیا ہوں اور اب پھر سنبھل کر رقص میں اس کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن ''میں'' تو ابھی تک اُس کرسی پر بیٹھا ہوا ہوں۔پھر اس کے ساتھ رقص کون کر رہا ہے؟ رقص بھی میں ہی کر رہا ہوں۔

پھر میں کہاں ہوں؟

میں رقص کر رہا ہوں یا کرسی پر بیٹھا ہوں؟

کرسی پر بیٹھا ہوا ''میں'' کھڑا ہو گیا ہے۔وہ مجھے بلا رہا ہے۔

''واپس لوٹ آؤ

شجرِ ممنوعہ کی داستان نہ دہراؤ۔واپس لوٹ آؤ۔جنت سے نکل کر تو زمین پر آ گئے تھے۔زمین سے نکال دیئے گئے تو کوئی ٹھکانہ نہیں ملے گا.....اس حوّا کو چھوڑ دو.....واپس لوٹ آؤ''

''میں'' پھر کرسی پر بیٹھ گیا ہے۔

میں بے اختیار کرسی پر بیٹھے ہوئے ''میں'' کی طرف بڑھتا ہوں۔کرسی پر بیٹھا ہوا ''میں'' پھر کھڑا ہو گیا ہے۔ہم دونوں بغل گیر ہوتے ہیں اور وہ میرے اندر چھپ جاتا ہے موسیقی کا بے ہنگم شور جاری ہے۔رقص بھی جاری ہے۔

''وہ شاید کوئی دوسرا ساتھی ڈھونڈ چکی ہوگی''میں یہ سوچتے ہوئے اُدھر دیکھتا ہوں۔

مگر وہ تو میرے سامنے بیٹھی ہے۔

اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ اور بے بسی کے اثرات ہیں۔

''میں تمہاری وجہ سے جنت بدر ہوا تھا مگر اب میں تمہاری وجہ سے زمین بدر نہیں ہو سکتا''

''میری وجہ سے.....؟''اس کی آنکھوں میں حیرت ہے

''تم شجرِ ممنوعہ تک لے جانے کی ذمہ دار ہو اور شجرِ ممنوعہ جنت سے نکلوانے کا ذمہ دار ہے''

''شجرِ ممنوعہ.....! گندم.....؟''

''گندم.....شاید.....!''

''کیا گندم اشجار پر اُگتی ہے؟''

''نہ میں عربی زبان جانتا ہوں نہ کسی تفسیری جھگڑے میں پڑنا چاہتا ہوں (جنت میں اشجار پر ہی اُگتی ہوگی)''

''تم روشنی سے خوفزدہ ہو''اس کا لہجہ خاصا تلخ ہو گیا ہے،

''پہلے بھی تمہارے ایسے ہی طعنوں نے مجھ سے گناہ کرایا تھا''

گندم میں نے نہیں کھلائی تھی''وہ چیخ پڑتی ہے،

''میں پھر کہتا ہوں کہ میں جھگڑنا نہیں چاہتا''

''تم نے گندم کی تہمت میرے سر کیوں لگائی؟''

''میں دوبارہ فریب میں نہیں آنا چاہتا''

''فریب!.....مرد عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا.....''اس کے لہجے میں بلا کا طنز ہے.....''اپنی عیاشی کا سامان بھی پورا کرتا ہے اور اپنی ساری غلطیوں کا بار بھی عورت ہی پر ڈالتا رہتا ہے''

''لیکن گندم.....''

''سنو!''.....وہ چلاّتے ہوئے بولتی ہے''گندم کی ہیئت پر غور کرو اور اپنی اس کمزوری پر بھی غور کرو جس کے بغیر تم نہیں رہ سکتے۔ بڑے بڑے تجرد پسند بھی جس کے لئے بالآخر مجبور ہو گئے''

''تم فحش اور ننگی باتیں کر رہی ہو''

''سچ کا کوئی لباس نہیں ہوتا اسی لئے ننگا نظر آ رہا ہے''

اس کا لہجہ بے حد زہریلا ہے اور میں ایک بار پھر اندھے پن کے احساس میں کھو گیا ہوں۔

''اندھیروں کے باسی تم اب بولتے کیوں نہیں''

اچانک ساری روشنیاں گل ہو گئی ہیں اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا اندھا پن ختم ہو گیا ہے، وہ گھبرا کر میرے قریب ہو جاتی ہے۔

''تم جس مصنوعی روشنی کی باسی ہو اس کا طلسم ٹوٹ جائے تو پھر دیکھ لو کیا ہوتا ہے''

میں اس سے یہ کہنا چاہتا ہوں لیکن کہہ نہیں سکتا کیونکہ روشنیاں پھر آ گئی ہیں۔ میرا اندھا پن بھی آ گیا ہے۔

اب ہماری میز پر ایک اجنبی بھی موجود ہے اجنبیت کے باوجود ہمیں اس میں اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔''شاید میں آپ لوگوں کی بحث کو کسی حتمی نتیجے تک پہنچا سکوں!''اجنبی پر خلوص لہجہ میں کہتا ہے۔

''ہماری بحث کا موضوع جنت بدر ہونے کا سبب یعنی گندم ہے''میں وضاحت کرتا ہوں۔

''کیا واقعی تمہیں جنت بدر کرنے کا سبب گندم ہی ہے؟''

''مجھے یاد تو کچھ ایسے ہی پڑتا ہے''میں ذہن پر زور دیتے ہوئے بتاتا ہوں۔

''مولوی صاحبان بھی یہی بتاتے ہیں''وہ میرے موقف کی تائید کرتی ہے۔

''مجھے شک پڑتا ہے آپ نے گندم کی بجائے اس کا بھوسہ کھا لیا ہوگا''

اجنبی کی اس بات پر ہم احمقوں کی طرح ہنستے ہیں۔

''ذہن پر زور دیجئے.....وہ گندم سرخ رنگ کی تو نہیں تھی؟''اجنبی سوال کرتا ہے.....پھر ایک بھرپور

قہقہہ لگاتا ہے اور خود بھی اس قہقہے میں گم ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں ہی جیسے نیند سے بیدار ہو گئے ہیں۔''سرخ گندم کا مطلب سمجھتی ہو؟''

''اوہ.....اب سمجھی.....اس کا اشارہ امریکی گندم کی طرف تھا''

''سالا کوئی کمیونسٹ معلوم ہوتا تھا''

''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں''

☆☆☆

آج صبح کے اخبارات میں قوم کو یہ نوید سنائی گئی ہے کہ قحط کے خطرے کے پیش نظر ایک دوست ملک سے طویل مدت قرض کی بنیاد پر کئی ہزار ٹن گندم خریدنے کے ایک معاہدے پر دستخط ہو گئے ہیں۔

میرے اندر کا''میں''سورج نکلنے سے پہلے ہی مر گیا ہے۔

☆☆☆

میں پھر اپنی حوا کو ملنے چلا گیا ہوں

پھر وہی رشنیاں ہیں.....وہی موسیقی ہے اور وہی رقص ہیں۔ میری وہ کرسی اب خالی پڑی ہے۔

یہ روشنیاں اب مجھے راس آ گئی ہیں اور میرا اندھا پن ختم ہو گیا ہے۔

اب میں اس کے اشاروں پر نہیں ناچ رہا بلکہ اسے اپنے اشاروں پر نچا رہا ہوں.....لیکن یہ کیا.....؟

سامنے دیوار پر نصب آئینے میں میرے اندر کے''میں''کی بے کفن لاش مجھے گھور رہی ہے۔

میں گھبرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہوں۔لیکن ادھر بھی بڑا آئینہ نصب ہے اور اس میں بھی وہی منظر ہے میرے چاروں طرف میری لاشیں بکھری ہوئی ہیں اور میں سوچ رہا ہوں:

''کاش میرا وہ اندھا پن ہی لوٹ آئے''

موسیقی کا شور کچھ اور بڑھ گیا ہے۔

ہمارے رقص کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔

لیکن ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہے۔ہم بے زمین ہو گئے ہیں۔

صرف اپنی لاشوں پر کھڑے رقص کر رہے ہیں۔
روشنیاں تیز ہوگئی ہیں۔
موسیقی کا شور مزید بڑھ گیا ہے
اور رقص کی رفتار مزید تیز ہوگئی ہے۔
تیز.....تیز.....اور تیز
روشنیاں موسیقی اور رقص
بے زمین لوگوں کا اپنی لاشوں پر رقص!

☆☆☆

حوّا کی تلاش

مِرے بدن پہ ترے وصل کے گلاب لگے
یہ میری آنکھوں میں کس رُت میں کیسے خواب لگے

مجھے یقین نہیں آ رہا۔
میں عالم برزخ میں ہوں،
عالم خواب میں ہوں،
یا عالم حقیقت میں ہوں؟

’’غالباً میں عالم حقیقت میں ہوں‘‘ کسی وہم کی طرح مجھے یقین ہو جاتا ہے اور میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ تھوڑی دیر بیٹھا رہتا ہوں پھر اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔

میرا مستقبل میرے داہنے ہاتھ پر اور میرا ماضی میرے بائیں ہاتھ پر ہمیشہ رقم رہتا تھا اور میں اپنے ماضی اور مستقبل کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے ہمیشہ حال میں رواں رہتا تھا۔ مگر اب میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی تحریر پڑھنا چاہی تو مجھے وہاں چاروں طرف دھند چھائی ہوئی نظر آئی۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی تحریر پڑھنا چاہی تو وہاں دھواں دھواں فضاؤں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔۔۔ بے چارگی کے احساس کے ساتھ میں نے اپنے حال کی طرف دیکھنا چاہا تو مستقبل کی ساری دھند میری آنکھوں میں اُتر آئی اور ماضی کا سارا دھواں میرے چاروں طرف رقص کرنے لگا۔ اس

عذاب ناک حالت میں مجھے بچپن کی وہ دعائیں بھی بھول گئیں جو میری ماں نے مجھے یاد کرائی تھیں۔لیکن میں مایوس نہیں ہوا۔آخر دھوئیں کا رقص دھواں ہونے لگا۔روشنی کی ایک لکیرا بھری اور ابھرتی چلی گئی،

"الم ترکیف فعل ربك با اصحاب الفیل"

دھند میری آنکھوں سے چھٹنے لگی اور دھواں دور ہٹنے لگا۔ مجھے اصحاب فیل کا انجام یاد آیا جو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے سامنے بکھرے ہوئے ایٹم بم کا شکار ہونے والے منظر کو دیکھا اور مجھے اصحاب فیل کی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا جو صرف کھائے ہوئے بھوسے کی مانند کر دیئے گئے تھے۔

عالمگیر ایٹمی جنگ ہو چکی ہے اور میں پتہ نہیں کیسے زندہ بچ گیا ہوں۔میرے چاروں طرف اس بھیانک جنگ کے اندھیرے پھیلے ہوئے ہیں۔ مجھے ان اندھیروں سے نکلنے کے لئے روشنی درکار ہے۔اور تب ہی جس قوت نے مجھے اس جنگ میں بھی زندہ رکھا تھا۔ مجھے روشنی عطا کرنی شروع کر دی۔روشنی کی جو لکیر پہلے ابھری تھی وہ اب ایک روشن ہالے کی شکل اختیار کر گئی ہے اور مجھ پر کرن کرن اتر رہی ہے،

"تجھے کیا معلوم ہے کہ حطم (ایٹم) کیا شے ہے؟ یہ اللہ کی خوب بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں کے اندر تک جا پہنچے گی تا کہ اس کی گرمی ان کو اور بھی زیادہ تکلیف دہ محسوس ہو"

"دنیا پر ایک شدید مصیبت آنے والی ہے اور تجھے کیا معلوم ہے کہ وہ مصیبت کیسی ہے؟ اور ہم پھر کہتے ہیں کہ اے مخاطب! تجھے کیا معلوم ہے کہ یہ عظیم الشان مصیبت کیا چیز ہے؟ یہ مصیبت جب آئے گی تو اس وقت لوگ پراگندہ پروانوں کی طرح ہوں گے اور پہاڑ اس پشم کی مانند ہو جائیں گے جو دھنکی ہوتی ہے۔"

"جب زمین کو پوری طرح ہلا دیا جائے گا۔اور زمین اپنے بوجھ نکال کر پھینک دے گی اور انسان کہہ اٹھے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے؟"

مجھے یاد آتا ہے کہ میں ایک پہاڑی علاقہ میں ٹھہرا ہوا تھا جب ایٹمی جنگ چشم زدن میں چھڑ گئی تھی

مگر اب کہیں بھی کوئی پہاڑ نظر نہیں آرہا۔ میں خود ہی حیرت سے پکار اٹھتا ہوں" یہ کیا ہو گیا ہے؟" اور قرآن کی صداقت کا ایک گواہ بن جاتا ہوں۔

مجھے یاد آتا ہے۔دو بڑی قوتیں ساری دنیا پر پھیل رہی تھیں۔ان میں مشرقی قوت کا جال زیادہ پھیلا ہوا تھا لیکن مغربی قوت بھی کم نہ تھی۔ عجیب عجیب نعرے تھے۔ عجیب عجیب نظریات تھے۔دونوں ہی انسانیت کی فلاح کی باتیں کرتے تھے اور اب دونوں ہی انسانیت کی تباہی کا موجب ہو گئے تھے جنگ کی ابتدا مشرق وسطیٰ سے ہوئی تھی۔وہاں کی تیل کی دولت۔ جسے دونوں بڑی قوتیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی تھیں۔پھر کیا ہوا؟۔۔ مجھے واقعات کا علم نہیں۔لیکن روشنی کا جو ہالہ مجھ پر کرن کرن اتر رہا ہے وہ مجھے بتانے لگتا ہے۔اس کا اپنا انداز بیان ہے۔

"خداوند کہتا ہے کہ میں نے اپنی غیرت سے اور قہر کی آتش سے کہا یقیناً اسی دن اسرائیل کی سرزمین میں ایک زلزلہ ہوگا۔ یہاں تک کہ سمندر کی مچھلیاں اور آسمان کے پرندے اور زمین کے چرندے اور سارے کیڑے مکوڑے جو زمین پر رینگتے پھرتے ہیں اور سارے انسان جو روئے زمین پر ہیں میرے سامنے تھرتھرا جائیں گے اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور کڑاڑے بیٹھ جائیں گے اور ہر ایک دیوار زمین پر گر پڑے گی.....ایک شدت کا مینہ اور بڑے بڑے اولے اور آگ اور گندھک برساؤں گا۔اسی طرح میں اپنی بزرگی اور تقدیس کراؤں گا اور بہتیری قوموں کی نظروں میں پہچانا جاؤں گا اور وہ جانیں گے کہ خداوند میں ہوں"

"دیکھ میں ترا مخالف ہوں اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار! میں تجھے پلٹ دوں گا..... اور میں تجھے ہر قسم کے شکاری پرندوں اور میدان کے درندوں کو خوراک کے لئے دوں گا۔تو کھلے ہوئے میدان میں گر پڑے گا.....اور میں ماجوج پر اور ان پر جو جزیروں میں بے پروائی سے سکونت کرتے ہیں ایک آگ بھیجوں گا.....اور آگے کو میں ہونے نہ دوں گا کہ وہ میرے پاک نام کو بے حرمت کریں"

"اور دنیا میں ایک حشر برپا ہو جائے گا اور وہ اول الحشر ہو گا اور تمام بادشاہ آپس میں ایک دوسرے پر چڑھائی کریں گے اور ایسا کشت وخون ہو گا کہ زمین خون سے بھر جائے گی اور ہر ایک بادشاہ کی

رعایا بھی آپس میں خوفناک لڑائی لڑے گی۔ ایک عالمگیر تباہی آوے گی اور ان تمام واقعات کا مرکز ملک شام ہوگا''

''اے یورپ تو بھی امن میں نہیں اور اے ایشیا تو بھی محفوظ نہیں اور اے جزائر کے رہنے والو! کوئی مصنوعی خدا تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ میں شہروں کو گرتے دیکھتا ہوں اور آبادیوں کو ویران پاتا ہوں''

میں خدا کی بزرگی اور تقدیس کا اقرار اور اپنے عجز کا اعتراف کرتا ہوں۔ روشنی کی کرنیں میرے جسم پر تو اُتر رہی ہیں مگر روح تک نہیں پہنچ پاتیں۔ شاید اسی وجہ سے میں صرف اپنے ماضی کی تحریریں ہی پڑھ سکا ہوں۔ مستقبل کی تحریروں کی یا تو زبان بدل گئی ہے یا اُنہیں پڑھنے کی میری قوت سلب ہوگئی ہے۔

ایٹمی جنگ نے آدم کی نسل کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا ہے اور اب ابن آدم ہونے کے ناطے اس وقت مجھے اپنا سب سے پہلا فریضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو آدم کی نسل کو اس دھرتی پر قائم رکھا جائے۔ شاید میں اس نئے عہد کا آدم ہوں۔

مگر نئی حوا۔۔۔۔؟

میں خدا کی تسبیح وتحمید کرتے ہوئے نئی حوا کی تلاش کے سفر پر روانہ ہوتا ہوں راستے میں تباہیوں کے کئی بھیانک منظر آتے ہیں۔ روشنی کا وہ ہالہ میرے ساتھ ہے اور اب بھی کرن کرن میرے جسم پر اتر رہا ہے۔ میرا نامعلوم اور اَن دیکھا سفر جاری ہے۔ ایک جگہ تو تباہی کا ایسا منظر آتا ہے جیسے یہاں ایک دم بیسیوں ایٹم بم گرا دیئے گئے ہوں میں خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ اور اس منظر سے چھپنے کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔

تب ہی روشنی کے ہالے کی کرنیں میری آنکھیں کھول دیتی ہیں،

''کیا یہ زمین میں نہیں پھرے کہ دیکھتے کہ ان سے پہلوں کا کیا انجام ہوا؟ وہ ملک میں ان سے تعداد اور طاقت میں بھی زیادہ تھے اور عمارت وغیرہ کے فنون میں بھی زیادہ ماہر تھے۔ لیکن ان کے اعمال نے ان کو کوئی نفع نہیں دیا تھا۔ اور جب ان کے پاس ان کے رسول نشانات

لے کر آئے تو ان کے پاس جو تھوڑا بہت علم تھا اس پر فخر کرنے لگے اور جس عذاب کی ہنسی اُڑاتے تھے اسی نے ان کو گھیر لیا۔ پھر جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہہ اٹھے ہم تو اللہ کو ایک قرار دیتے ہوئے اس پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے ساتھ جن چیزوں کو ہم شریک قرار دیا کرتے تھے ان کا ہم انکار کرتے ہیں۔ پس جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو ان کے ایمان نے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ یہی اللہ کی مقررہ سنّت ہے جو اس کے بندوں میں جاری چلی آتی ہے''۔

میں تہیہ کرتا ہوں کہ مجھ آدم سے جو نسل چلے گی اسے میں ان صحیفوں کی تعلیمات کے مطابق خود تربیت دوں گا اور میری نسل شیطان کے چنگل میں دوبارہ اس طرح نہیں آئے گی کہ خدا کے عذاب کا شکار ہو جائے۔ نسل کی تربیت کے احساس کے ساتھ اپنے جیون ساتھی کی تلاش کا خیال پھر شدت سے ابھرتا ہے۔ میرے لئے اب رات یا دن کی کوئی اہمیت نہیں اس لئے کہ روشنی کا ہالہ اگر میرے ساتھ نہ ہو تو میرا دن بھی تاریک ہو جائے۔ جب بھی کہیں تھکن کا احساس ہوتا ہے ٹھہر جاتا ہوں، ستا لیتا ہوں۔ شاید نیند بھی کر لیتا ہوں یا صرف اونگھ لیتا ہوں۔ میں بدترین تباہی کے اس علاقہ سے تیزی سے نکلنے لگتا ہوں پتہ نہیں ان دہشت ناک مناظر کے خوف سے یا جیون ساتھی کی تلاش کے خیال سے جو پہلے سے زیادہ شدید ہو گیا ہے۔

جب میں اس علاقہ سے باہر آتا ہوں تو مجھے پہلی دفعہ احساس ہوتا ہے کہ میں نے کئی دنوں کی مسلسل مسافت کے باوجود کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ بھوک کا احساس بیدار ہو جائے تو اسے سلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بھوک کا احساس میرے جسم کے ساتھ ذہن اور روح پر بھی تھکن طاری کرنے لگتا ہے۔

میں چل رہا ہوں مگر مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ میرا وجود شل ہونے لگتا ہے۔ میں اپنی بے بسی کے اقرار کے ساتھ خدا کی عظمت اور بزرگی کا اقرار کر کے اس کی تسبیح اور تحمید کرتا ہوں۔ تب ہی روشنی کے اس ہالے سے ایک کرن میرے جسم پر کسی تیر کی طرح اترتی ہے اور مجھ پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے،

''کیا انسان کو معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو ایک حقیر قطرہ سے پیدا کیا ہے۔ پھر وہ سخت جھگڑالو

بن جاتا ہے اور ہماری ہستی کے متعلق باتیں بنانے لگ جاتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔''

میں خدا کے جلال کے آگے جھک جاتا ہوں۔ لبوں سے یا دل سے کوئی دعا نہیں نکلتی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک جھڑی ہے جو تسبیح کے دانوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی ہے۔۔ یہ آنسو اپنی بے بسی اور خدا کی عظمت کا خاموش اقرار ہیں۔

میں کتنی دیر تک اسی کیفیت میں سربسجود رہتا ہوں جب دل کا بوجھ کسی حد تک اتر جاتا ہے تو سجدے سے سر اٹھاتا ہوں۔ بھوک کی شدت میں بڑی حد تک کمی ہو گئی ہے اور تھکن کا احساس بھی ایک حد تک زائل ہو گیا ہے۔ میں پھر اپنے سفر پر روانہ ہوتا ہوں۔ چلتے چلتے مجھے دور کہیں ہریالی کا گمان ہوتا ہے۔ میں بے ترتیب راستوں سے اس سمت چل پڑتا ہوں۔

یہ تو کوئی خاصا زرخیز علاقہ ہے۔ دور دور تک ہرے بھرے کھیت ہیں اور کھیتوں کے ساتھ ہی ایک خوبصورت سا باغ بھی ہے۔ باغ بڑے جدید انداز میں آراستہ ہے۔ درمیان میں ایک خوبصورت فوارہ بھی لگا ہوا ہے۔ اس خوبصورت باغ میں پہنچ کر تھکن تو دور ہو گئی مگر بھوک نے مزید شدت اختیار کر لی لیکن فوارے کے ٹھہرے ہوئے پانی میں مچھلیاں دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا ہوں۔

کھیتوں کے ہرے بھرے راستے سے لے کر اس باغ تک مجھے کوئی ذی روح نظر نہیں آیا تھا۔ ذہن پر زور دیتا ہوں تو یاد آتا ہے راستے میں کچھ جانور مَرے پڑے تھے۔ مگر چونکہ میں اس سے زیادہ بھیانک تباہیوں سے گذر کر آیا تھا اس لئے میں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ اب مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ اس علاقہ پر زہریلی گیس کے بم پھینکے گئے تھے۔ تمام ذی روح مر چکے ہیں اور ساری فصلیں اور پھل زہریلے ہو چکے ہیں۔

روشنی کا وہ ہالہ بدستور اپنی کرنیں میرے جسم پر اتار رہا ہے۔ میں عجب گومگو کی حالت میں ہوں۔ بھوک اب اتنی شدت اختیار کر چکی ہے کہ مجھے لگتا ہے اگر میں نے کچھ نہ کھایا تو موت سے نہیں بچ پاؤں گا۔ مگر سارے پھل زہریلے ہو چکے ہیں۔

''مرنا ہی ہے تو بھوکے پیٹ کیوں مرا جائے'' یہ سوچ کر بالآخر میں نے پھلوں کو توڑ توڑ کر کھانا شروع کر دیا ہے۔ مجھے کچھ ہوش نہیں میں کب تک پھل توڑ کر کھاتا رہا ہوں۔ ہوش تب آیا جب

میں فوارے کا زہریلا پانی پی کر باہر آیا۔

اب میں اطمینان سے اپنی موت کا منتظر ہوں۔ مگر مجھے تو حیرت انگیز طور پر اپنے اندر توانائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ روشنی کا ہالہ اب کتنی ہی کرنیں میرے جسم پر اتار رہا ہے،

''وہی ہے جو مایوسی کے بعد بارش اتارتا ہے اور اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے''

''اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ اس حال میں کہ تو اسے پسند کرنے والا بھی ہے اور اس کا پسندیدہ بھی۔''

میں ایک بار پھر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں جہاں سے بچایا گیا ہوں وہاں کے تابکاری اثرات میرے اندر کچھ اس طرح سرایت کر چکے ہیں کہ وہ میری ہلاکت کی بجائے اس زہریلی گیس کی ہلاکت کا باعث بن گئے ہیں جو اس وقت موجود پھلوں اور پانی میں ہے۔ گویا وہ تابکاری اثرات اس طرح میری بقا کی ضمانت بن گئے ہیں۔ غالباً اسی لئے میں کتنے ہی متعفن مقامات سے گزرنے کے باوجود بیمار بھی نہیں ہوا اور یہ جو اتنی قوت مجھ میں آ گئی ہے کہ میں سینکڑوں میلوں کی مسافت طے کر کے یہاں تک آ پہنچا ہوں یہ بھی ان اثرات کے سبب سے ہی ہے۔

''پس تم اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے۔''

میں اپنی خوراک کے مسئلے سے اب بالکل مطمئن ہو جاتا ہوں۔ مجھے اب ان دو بڑی مشرقی اور مغربی قوتوں کے انجام کا خیال آتا ہے۔ دونوں قومیں ہی فتنے میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھیں۔ روشنی کا ہالہ میرے قریب آ جاتا ہے اور پھر کرن کرن میرے جسم پر اترنے لگتا ہے۔

یکا یک روشنی کا ہالہ پورے کا پورا میرے جسم پر اتر آتا ہے،

''تم پر آگ کا ایک شعلہ گرایا جائے گا اور تانبا بھی گرایا جائے گا پس تم دونوں ہرگز غالب نہیں آ سکتے اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے۔''

روشنی کا ہالہ پھر اپنے اصل فاصلے پر چلا جاتا ہے اور پھر کرن کرن میرے جسم پر اترنے لگتا ہے۔ میں دونوں بڑی قوتوں کی تباہی کا یقین کر لیتا ہوں۔

جیون ساتھی کی جستجو کا خیال پھر مجھے مستعد کر دیتا ہے۔اور میں نیا آدم ہونے کے ناطے بقائے نسل انسانی کے مقدس فرض کی خاطر ایک نئے عزم کے ساتھ چل پڑتا ہوں۔

باغ والے اس گاؤں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک شہر آباد ملتا ہے۔ساری عمارتیں سلامت ہیں مگر شہر پر موت کی حکمرانی ہے۔دوکانیں کھلی ہوئی ہیں مگر لوگ نیچے گرے ہوئے ہیں۔ کہیں دیواروں کے ساتھ لگے کھڑے ہیں بیشتر دوکاندار کاؤنٹر پر یوں سر رکھے ہوئے ہیں جیسے آرام کر رہے ہوں۔

مجھے بچپن کی وہ کہانی یاد آتی ہے جس میں ایک شہزادہ ایک ایسے شہر میں داخل ہوتا ہے جہاں ہر آدمی پتھر کا بت بنا ہوتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے میں بھی کوئی شہزادہ ہوں۔مگر کہانی والے شہزادے کو اُس شہر کو زندہ کر دینے میں اس لئے آسانی ہوتی ہے کہ وہ کسی جادوگر کے طلسم کے باعث ویسا ہوا ہوتا ہے۔ جب کہ یہ شہر تو انسان کے اپنے ہی طلسم کا شکار ہو گیا ہے۔زہریلی گیس کے بموں نے سارے شہر میں کوئی ذی روح نہیں چھوڑا۔

میں کسی تھکے ہارے، افسردہ شہزادے کی طرح ایک خوبصورت ڈیپارٹمنٹل سٹور میں داخل ہوتا ہوں۔مگر ایک دم گھبرا کے پیچھے پلٹنے لگتا ہوں۔سامنے کوئی وحشت زدہ آدمی کھڑا ہے۔ میں پیچھے ہٹتے ہوئے پھر رک جاتا ہوں۔سامنے تو بڑا سا قد آدم آئینہ نصب ہے۔

”تو کیا.....؟ کیا.....یہ.....میں ہوں؟“

میں خود کو پہچاننے سے انکار کر دیتا ہوں۔مگر بالآخر مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ میں ہی ہوں۔اپنی پہچان کو تسلیم کرتے ہی مجھے پہلی دفعہ اپنی برہنگی کا احساس ہوتا ہے۔اسی اثنا میں آئینے میں مجھے بالکل اپنے ہی جیسی ایک وحشت زدہ عورت نظر آتی ہے۔ میں تیزی سے پلٹتا ہوں۔اپنی تمام تر وحشت کے باوجود اس کا چہرہ بتا رہا ہے کہ وہ مغربی عورت ہے۔اس کی آنکھوں میں تلاش اور تجسس ہے۔وہ مجھے حیرانی سے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ پتہ نہیں اپنے باپ کو تلاش کر رہی ہے، بھائی کو تلاش کر رہی ہے یا بیٹے کو....اس کی آنکھوں میں یکا یک چمک پیدا ہوتی ہے۔جیسے اس نے پہچان لیا ہو۔اور پھر وہ دوڑ کر مجھ سے بُری طرح چمٹ کر سسکنا شروع کر دیتی ہے۔ میں

نہیں جانتا اس نے مجھے باپ سمجھا ہے۔ بھائی سمجھا ہے۔ بیٹا سمجھا ہے یا کوئی اور۔۔لیکن میں مطمئن ہوں کہ اب آدم کی نسل اس دھرتی سے ختم نہیں ہو گی۔

میرے ماضی اور مستقبل کی تحریریں میرے دائیں بائیں ادب کے ساتھ کھڑی ہیں۔ اور میرا ”برہنہ حال“ میرے برہنہ جسم سے چمٹا مشرق اور مغرب کی نفرتوں کو اپنے آنسوؤں سے صاف کر رہا ہے۔

روشنی کا ہالہ ہم دونوں کے جسموں سے گزر کر ہماری روحوں میں اتر جاتا ہے اور ہم دونوں کے اندر سے ایک خوبصورت آواز ابھرتی ہے،

”اب بتاؤ کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے۔“

☆☆☆

اپنی تجرید کے کشف کا عذاب

راستے تو کھو چکے تھے اپنی ہر پہچان تک
ہم جنازے منزلوں کے خود اُٹھا کر آئے ہیں

میں ایک فنکار ہوں۔

ایک مصور ہوں۔

اپنی ذات کی دریافت کے لامتناہی عمل سے گزرتے ہوئے جب میں اپنی تجرید کے کیف آور لمس سے آگاہ ہوا تو اپنے اس کشف پر میں خود بھی حیرت زدہ رہ گیا۔

میں نے اس لمس کو اپنی روح میں اتار لینا چاہا۔ مگر عجیب بات تھی کہ میں اس کے سرور میں بھیگا ہوا تھا پر اسے چھونے کی صلاحیت سے محروم تھا۔

''یہ کیسا کشف ہے...... یہ کیسا گیان ہے؟'' میں نے خود سے پوچھا۔

''خارجی دنیا کو بھی تمہارے اس کشف کا ادراک ہونا چاہئے''

ایک مقدس آواز ابھری اور پھر ڈوب گئی۔

میں ایک مصور ہوں۔

رنگوں کی دنیا کا بادشاہ۔

رنگ جو روشنی کا اظہار کرتے ہیں۔

لفظوں میں ڈھل جائیں تو عظمتوں کے مینار بنتے ہیں۔

تاروں پر گریں تو زندگی کے سارے راز آشکار ہوتے ہیں۔

رنگ۔۔۔جن سے آرٹ کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

تب میں نے اپنے فن پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی سوچ کے کینوس پر ایک شاہکار بنانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے مرحلے میں، میں نے لفظوں کے سرخ رنگ سے اپنی تجرید کو پینٹ کرنا شروع کیا۔

گہرا سرخ، ہلکا سرخ، گلابی، عنابی۔۔۔

میں تصویر بنانے میں مگن تھا لیکن جب تصویر بنانے کا پہلا مرحلہ مکمل ہوا تو میری آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں۔ ساری سرخی آہستہ آہستہ سفیدی میں ڈھل رہی تھی۔ خون سفید ہونے کا محاورہ تو سننے میں آیا تھا مگر یہ رنگ؟۔۔لیکن خون بھی سفید کب ہوتا ہے۔ خون تو سرخ ہی ہوتا ہے اور جو سفید ہوتا ہے اسے خون نہیں کہتے۔

رنگوں کی ساری سرخی سفیدی میں ڈھل چکی ہے اور مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ محاورتاً سہی (اور یہ محاورہ بھی غلط سہی) میرا خون سفید ہو چکا ہے۔ میں اپنے جسم سے نکل بھاگنا چاہتا ہوں۔ مگر اس کی دیواروں سے سر ٹکرا کر رہ جاتا ہوں.... دہشت زدہ ہو کر خود کو دیکھنے لگتا ہوں۔

تب میری تجرید کے انکشاف کا وہی لمحہ دوبارہ میرے اندر جاگتا ہے۔ حالانکہ یہ کشف بھی وہی ہے، لمس بھی وہی۔ مگر اس دفعہ اس میں ایک نئے ذائقے، نئی لذت اور نئے سرور کا احساس ہوتا ہے۔ شاید اسی احساس کے باعث میں اپنی تجرید کو پھر کینوس پر منتقل کرنے لگتا ہوں۔ پہلی تصویر کے رنگ اگرچہ سفید ہو چکے ہیں تاہم ان رنگوں کی مہک ابھی تک موجود ہے اور کہیں کہیں مدھم مدھم مٹتے ہوئے سے سرخ نشان بھی موجود ہیں۔

اب میں سبز لفظوں کے رنگ سے پینٹ کر رہا ہوں،

گہرے سبز، آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والے، ہرے بھرے کھیتوں جیسے رنگ، مقدس دھرتی پر بکھرے ہوئے بیسیوں مقدس مناظر جیسے مقدس رنگ۔ میں ایک گونہ مسرت اور روحانی انبساط سے سرشار پینٹ کر رہا ہوں۔

مگر یہ کیا؟۔۔میں خوف سے اپنی آنکھیں میچ لیتا ہوں۔

اور وہ میری اندر کی آنکھوں سے میرے اندر اُتر آتی ہے۔

میں بے بس ہوکر آنکھیں کھول دیتا ہوں اور وہ میرے اندر سے نکل کر پھر سامنے آجاتی ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔میں کلر ٹیوب کو چیک کرتا ہوں۔اس پر ''سبز'' لکھا ہوا ہے۔

''پھر یہ کینوس پر ہریالی کی بجائے پیلاہٹ کہاں سے آگئی؟'' میں جیسے اپنے آپ سے پوچھتا ہوں۔پھر کلر ٹیوب کو ایک ہاتھ میں لے کر دباتا ہوں۔ڈھیر سارا رنگ نکل کر فرش پر گرتا ہے اور میری خاموش چیخیں اس میں گھل جاتی ہیں۔ٹیوب کے اندر سارا پیلا رنگ بھرا ہوا ہے۔

ہری ٹیوب میں پیلا رنگ مگر سرخ ٹیوب سے تو سرخ رنگ ہی نکلا تھا۔پھر وہ کیسے سفید ہوگیا؟ میں اپنے کشف میں اس خارجی دنیا کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں مگر یہاں رنگ ہی میرا ساتھ نہیں دے پارہے۔ مجھے عجیب سی بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ بے چارگی اور مایوسی کے اندھیرے چاروں طرف رقص کررہے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے میرے اندر والے فنکار کو قتل کردیا ہے اور میں اپنی لامتناہی تلاش کے سفر میں ایک ایسے ٹیلے پر کھڑا ہوں جس کے ایک طرف سر بفلک دشوار گزار پہاڑ ہیں اور دوسری طرف گہرا ناقابل عبور سمندر۔ ایک طرف سینکڑوں اژدہوں اور عفریتوں کی پھنکاریں ہیں تو دوسری طرف آبی بلاؤں کی چیخیں۔میں اپنے آپ کو پکارنا چاہتا ہوں مگر میری صدا بھی کہیں کھوگئی ہے۔

میں ٹیوبوں کو ایک ہی برتن میں خالی کردیتا ہوں۔

سبز،سرخ، پیلا، نیلا ،نسواری۔۔۔۔پتہ نہیں کون کون سے رنگ ہیں۔

سارے رنگوں کو گھول کر میں اپنی انگلیوں کو کینوس پر وحشیانہ انداز میں پھیرنا شروع کردیتا ہوں۔سارے رنگ انتہائی بھونڈے طریقے سے کینوس پر مل دیتا ہوں۔

اس کے ساتھ ہی جیسے میری دیوانگی ختم ہوجاتی ہے۔سارا وحشیانہ پن ختم ہوجاتا ہے۔

اب میری حیرت کا دوسرا رُخ بیدار ہوتا ہے

کینوس پر میری وہ تجرید کسی بھرپور شاہکار کی طرح موجود ہے۔

میں اس کا مفہوم ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں اور معنویت کے سرے بے معنویت سے ملاتا ہوں۔ تب میری تجرید کی ساری معنویت مجھ پر آشکار ہوتی ہے۔۔یہ معنویت اتنی گھناؤنی اور مکروہ ہے کہ میں کسی کو بھی اس سے آگاہ کر کے خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ یہ معنویت صرف میری نہیں۔۔۔ہم سب کی ہے۔

شاید اسی لئے وہ مقدس آواز بھی اب نہیں آرہی ہے جس نے کہا تھا:

''خارجی دنیا کو بھی تمہارے اس کشف کا ادراک ہونا چاہیے!''

☆☆☆

بے ترتیب زندگی
کے چند ادھورے صفحے

جو میری روح میں بس زہر گھولتا ہی رہے
مرے نصیب میں چینی کا کارخانہ تھا

یہ کہانی اس عجیب وغریب لمحے سے شروع ہوتی ہے جب تقدیر کے بارے میں میرے شکوک یقین کی حد تک پختہ ہو چلے تھے۔اسی لمحے میں تقدیر کو ایک ڈھونگ سمجھ کر اسے سرمایہ داروں کا استحصالی ہتھکنڈہ قرار دینے ہی والا تھا کہ کسی نامعلوم قوت نے اس لمحے کو منجمد کر دیا اور میں شک اور ایمان کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

ملک میں حکومت کی تبدیلی سے پالیسیوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ پہلے مزدوروں کو جتنی بے جا چھوٹ دی گئی تھی اب اس سے بھی زیادہ بے جا گرفت ہو رہی تھی۔اس حد تک کہ میں جو مزدوروں کی بے جا چھوٹ کے عہد میں اپنی مزدور یونین کا معتوب مزدور تھا، مجھے اس یونین کا سرگرم رکن بن جانا پڑا۔اس لئے کہ مسئلہ میری ذات کا نہ تھا مزدور کے اجتماعی مفاد

کا تھا۔انہیں دنوں ایک اور صنعتی ادارے میں ایک معمولی سے بہانے کی آڑ میں سینکڑوں مزدوروں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیئے گئے۔ یہ حکومت کی طرف سے ملک کے تمام مزدوروں کو بھرپور عملی دھمکی تھی۔مزدور اس دھمکی سے مرعوب ہونے کی بجائے مزید اشتعال میں آ گئے۔تاہم سرمایہ داروں اور ان کے ایجنٹوں کے حوصلے بھی بلند ہو گئے۔اس صورت حال میں جب میری اپنے چیف کے ساتھ ٹھن گئی تو غیر متوقع طور پر انہیں کئی دفعہ میرے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔میری ان غیر متوقع کامیابیوں نے میرے اس شک کو مزید تقویت پہنچائی کہ تقدیر کا شوشہ سرمایہ داروں اور استحصالی قوتوں کی اختراع ہے۔

میں شک اور ایمان کے درمیان اس منجمد لمحے میں معلق تھا جب روشنی کی ایک کرن مجھ پر اُتاری گئی۔اس کرن نے مجھے مقدر کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔لیکن جب اس نے یہاں تک کہا کہ دانے دانے اور قطرے قطرے پر نام لکھ دیا جاتا ہے تو مجھے اپنے شدید اختلاف کا اظہار کرنا پڑا۔ تب اس کرن نے مجھے پانی کے ایک قطرے کی بابت علم دیا کہ اس پر میرا نام لکھا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی مجھے اس قطرے کی پہچان اور اس کے ذائقے سے آگاہی کی خاص قوت بھی گئی۔روشنی کی اس کرن نے واپس جاتے ہوئے کہا:

”تمہیں اس امر کی کھلی چھٹی ہوگی کہ تم اس قطرے پر لکھی تحریر کو مٹا سکو“

☆☆☆

ملز کا صنعتی امن سخت خطرے میں ہے۔ملز انتظامیہ جھلاہٹ کا شکار ہے۔ادھر ہماری پے در پے کامیابیوں نے ہمارے حوصلے بھی بلند کر رکھے ہیں نتیجتاً کسی مفاہمت کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔اپنے چیف کو میں نے زچ کر کے رکھ دیا ہے۔ذاتی طور پر مجھے کئی خوشنما لالچ بھی دیئے گئے مگر میں لیڈری کی دھن میں مست چلا جا رہا ہوں۔لیکن ایک اچانک اور غیر متوقع حادثے نے مجھے منتشر کر کے رکھ دیا۔ملز انتظامیہ کا پورا بورڈ بیٹھا ہوا تھا جب مجھے بلایا گیا۔وہاں ملز کے جنرل منیجر نے صنعتی گڑبڑ کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ڈالتے ہوئے مجھے انتہائی غلیظ اور لچر گالیاں دیں۔ میں اپنی ڈیوٹی کی جگہ پر نہیں تھا اس لئے بہت کچھ کر سکنے کے باوجود بھی کچھ نہ کر سکا۔صبر وتحمل سے

گالیاں کھا کر لوٹ آیا۔

ملز میں پے در پے کامیابیوں کے بعد یہ میری پہلی اور بھرپور ناکامی تھی۔

☆☆☆

ملز کے بیکنگ ہاؤس کے انچارج نے جو خود بھی یونین کا سرگرم رُکن تھا۔ میرے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کیا۔ چائے منگوائی اور ہم آئیندہ لائحہ عمل کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ چائے کا کپ ہاتھ میں لیتے ہی میری ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ قطرہ جس پر میرا نام لکھا تھا اس چائے میں موجود تھا۔ میں نے کچھ دیر اسے غور سے دیکھا۔ سوچا۔ اور پھر چینی کی ایک بوری پر پورے کپ کو اس طرح انڈیل دیا کہ وہ قطرہ بھی اس میں جذب ہو جائے۔

میرا مزدور ساتھی مجھے ہونقوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔

یہ تقدیر کے مقابلہ میں میری پہلی کامیابی تھی۔

☆☆☆

ملز میں پے در پے کئی اہم واقعات ہو گئے ہیں۔ ملز انتظامیہ کی اشتعال انگیزیوں کے نتیجہ میں مزدوروں نے ایک دن چار پانچ افسروں کی زوردار پٹائی کر دی۔ مگر افسوس جنرل منیجر اس ہنگامے سے بچ نکلے۔

پولیس آئی۔ گرفتاریاں ہوئیں۔ آخر پندرہ مزدوروں کے استعفوں پر مفاہمت ہو گئی۔ تمام جھوٹے سچے مقدمات بھی واپس لے لئے گئے۔ جس دن پندرہ مزدوروں کے استعفوں کا معاہدہ ہوا میرے چیف نے خاص طور پر فون کر کے میری خیریت دریافت کی۔ مجھے اس بھرپور شکست کا احساس تھا۔ مگر جب مزدوروں کے ہاتھوں افسروں کی زوردار بلکہ چٹخارے دار پٹائی کا خیال آتا تو اس شکست کا احساس زائل ہونے لگتا۔ یوں بھی پٹائی کرنے والے مزدوروں نے تو کوڑے کھانے اور قیدیں بھگتنے کی توقعات کے ساتھ یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ گویا محض استعفے دے کر وہ سستے چھوٹ گئے۔ پھر بھی سبکی کا ایک احساس ضرور موجود رہا۔ میں اور تو سب کچھ بھول سکتا تھا مگر جنرل منیجر کے گھٹیا سلوک کو فراموش کرنا میرے لئے بے حد مشکل تھا۔ اپنی توہین کا انتقام لینے کے لئے

میں کسی مقدر سے بھی ٹکرا جانے کے لئے تیار تھا۔

☆☆☆

ایک چھٹی کے موقعہ پر ہمارے پورے سٹاف نے ایک بھرپور پکنک منانے کا پروگرام بنایا۔ خاصی دلچسپ پارٹی تھی۔ مگر کوکا کولا کی ایک بوتل کھولتے ہی مجھے احساس ہوا کہ پانی کا وہ قطرہ اس بوتل میں موجود ہے۔ میں نے طنزیہ انداز میں اس قطرے کو دیکھا اور پوری بوتل نہر میں انڈیل دی۔ میری چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

یہ مقدر کے مقابلہ میں میری دوسری کامیابی تھی۔

☆☆☆

میرے چیف کی سرگرمیاں میرے خلاف بڑھتی جا رہی تھیں۔ لگتا تھا وہ میرے سارے قرض یکمشت چکا دینا چاہتے ہیں مگر پھر ایک دن انہوں نے زندگی کے سارے قرض بھی چکا دیئے۔ اچانک اطلاع ملی کہ وہ دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے ہیں۔ ملز انتظامیہ کا پورا بورڈ کنارے پر موجود تھا مگر کوئی بھی اپنے ڈوبتے ساتھی کی مدد نہ کر سکا۔

اس سانحہ کے کچھ عرصہ بعد چینی کی بلیک مارکیٹنگ کی تحقیق کے دوران کوکا کولا کی انتظامیہ نے حکام کو بتایا کہ انہوں نے چینی ہماری شوگر ملز سے خرید کی تھی۔ چنانچہ ملز پر چھاپہ پڑا اور تحقیقات کا سلسلہ وسیع ہوتا گیا۔

☆☆☆

ایک عزیز کی شادی کے سلسلہ میں چند دنوں کے لئے کراچی جانا پڑا تو وہاں ایک دن سمندر کی سیر کا پروگرام بھی بن گیا۔ میں سمندر کی بل کھاتی اور لہراتی ہوئی لہروں کو آتے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر خود بھی سمندر میں اتر آیا لہروں کا مجھے چھو کر دور تک چلے جانا اور پھر شریر انداز میں واپس ہونا مجھے بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ میں جیسے کھو سا گیا۔ ایسے میں ایک لہراتی ہوئی لہر کو آتے دیکھ کر میں نے اپنے ہونٹوں کو دائرے کی شکل میں وا کیا اور اس لہر کا پانی اپنے منہ میں بھرنے کے لئے انتظاریہ حالت میں کھڑا ہو گیا۔ اچانک مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں جیسے نیند سے بیدار ہو گیا۔

اپنے ہونٹوں کے دائرے کی عین سیدھ میں آتی ہوئی لہر میں مجھے وہ قطرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ سختی سے بند کر لئے اور جونہی وہ قطرہ میرے قریب پہنچا میں نے ایک زوردار ہاتھ مار کر اسے پرے پھینک دیا۔ یہ مقدر کے مقابلہ میں میری تیسری شاندار کامیابی تھی۔

☆☆☆

ملز انتظامیہ کی زیادتیوں کا یہ عالم تھا کہ وہ میری تعلیم اور صلاحیتوں کو جانتے ہوئے بھی نہ صرف مسلسل نظرانداز کر رہی تھی بلکہ اس کا رویہ میرے خلاف خاصا جارحانہ تھا۔ جائز حقوق کی پامالی نے میرے اندر کے باغی کی حوصلہ افزائی کی۔ میں اب مقدر کو بڑی حد تک ڈھونگ سمجھنے لگا تھا۔ لیکن ملز پر پڑنے والے چھاپے کے نتیجہ میں جب جنرل منیجر کے بجائے وہ افسر گرفت میں آیا جس نے ایک دفعہ ایک غریب مزدور کو ناجائز طور پر گرفتار کروا کے نہ صرف پولیس سے پٹوایا تھا بلکہ پھر اسے ملازمت سے بھی نکلوا دیا تھا۔۔۔تو مجھے قدرت کے نظام پر ازسرِ نو غور کرنا پڑا۔

☆☆☆

پانی کا گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ قطرہ اس گلاس میں موجود تھا۔ میں نے اس گلاس کو میز پر رکھ دیا۔ ایک دوسرے گلاس میں پانی منگوایا۔ پھر دوسرے گلاس کو پہلے گلاس سے یوں ٹکرایا جیسے جام سے جام ٹکرائے جاتے ہیں۔ دوسرے گلاس کا پانی پی کر اس پہلے گلاس کو پھر اٹھایا۔ اس قطرے کو ایک فاتحانہ انداز سے دیکھا اور پھر ’’تقدیر کے نام جام صحت‘‘ کہہ کر اس گلاس کو فضا میں اچھال دیا۔ پانی زمین پر گر کر پھیلنے اور پھر اس میں جذب ہونے لگا۔

تقدیر کے مقابلہ میں یہ میری چوتھی کامیابی تھی۔ مجھے اپنے پاؤں زمین پر ٹکتے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ محسوس کر رہا تھا کہ میں اب ہر استحصالی قوت سے ٹکرا سکتا ہوں۔

☆☆☆

ملز میں چینی کی بلیک کے اسکینڈل کی تحقیقات کا کوئی واضح رخ ابھی تک سامنے نہیں آیا۔ تاہم افواہیں گرم ہیں کہ ملز کے منیجنگ ڈائریکٹر، جنرل منیجر اور کچھ افسروں کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے ہیں۔ جبکہ یہ تمام افسران غائب ہیں۔

میری دلی خواہش ہے کہ اس معاملہ میں کم از کم جنرل منیجر کا انجام ضرور ذلت آمیز ہو۔

☆☆☆

میں شہر سے ایک قریبی گاؤں میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تو وہیں گھرے گھرے بادلوں نے آ لیا۔ اصولاً مجھے واپسی کی فکر کرنی چاہیے تھی لیکن موسم اتنا خوشگوار اور شاعرانہ تھا کہ میں اس سے بچوں کی طرح لطف اندوز ہونے لگا۔

ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوئی تو میں نے بارش کے ٹھنڈے اور میٹھے قطرے اپنے منہ میں ڈالنے کے لئے ہونٹ کھولے اور منہ اوپر کیا۔ میری آنکھیں بارش کے باعث جھپک رہی تھیں۔

اچانک میں نے دیکھا وہی قطرہ سیدھا میرے منہ کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے ہونٹ بند کر لئے اور پھر اس قطرے کو زمین پر گرتا دیکھنے لگا۔ مجھے اس قطرے کی بے بسی پر رحم آنے لگا۔

میں نے تقدیر کو خشکی کے راستے سے بھی شکست دی۔ پانی کے راستے سے بھی شکست دی۔ اور اب آسمان کے راستے سے بھی میں نے اسے شکست دے دی تھی۔

میں اپنی عظمت کو خود ہی حیرت سے دیکھنے لگا!

☆☆☆

اتنے دن غائب رہنے کے بعد آج جنرل منیجر ملز میں دیکھے گئے۔ معلوم ہوتا ہے ضمانت کرا کے آئے ہیں۔ لیکن سہ پہر تک اطلاع ملتی ہے کہ پولیس نے جنرل منیجر کی کوٹھی کو گھیرے میں لے کر، اس کی پچھلی کھڑکی کے شیشے توڑ کر، اس راستے سے اندر داخل ہو کر موصوف کو گرفتار کر لیا ہے۔

مجھے عجیب سی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔

☆☆☆

مسرت کی اس عجیب سی کیفیت کے ساتھ میں کین کیریئر کی طرف آتا ہوں۔ یہاں گنے سے لدے ہوئے کتنے ہی ٹرک، ٹرالیاں اور بیل گاڑیاں موجود ہیں۔ میں ایک ٹرالی سے ایک اچھا سا گنا نکال کر، اسے صاف کر کے دانتوں سے چھیلتا ہوں۔ مگر پہلی گنڈیری چوستے ہی مجھے احساس

ہوتا ہے کہ وہ قطرہ میرے منہ میں پہنچ چکا ہے۔اس کے ذائقے سے آگاہی کی جو خاص قوت مجھے دی گئی تھی وہ اس کی تصدیق کر رہی تھی۔

وہ قطرہ پوری طرح میرے منہ میں گھل گیا تھا۔ میں نے تھوک کر اس قطرے کو پھینک دینا چاہا۔

لیکن پھر دانستہ طور پر اس قطرے کو حلق سے نیچے اتار لیا۔

اس قطرہ کے میرے اندر جاتے ہی میرے اندر روشنی سی بھر گئی۔ میری انا سے تکبر کی ساری گرد اُتر گئی اور پھر میری انا اس روشنی میں ڈوب گئی۔اس روشنی میں، میں نے آنے والے تمام دنوں کو دیکھ لیا۔اور میرے چہرے پر اطمینان کا نور پھیل گیا۔

تب ہی وہ منجمد لمحہ پگھل گیا جس نے اس کہانی کی ابتدا کی تھی۔

☆☆☆

پتھر ہوتے وجود کا دکھ

بکھر گئے ہیں ملن کے تمام دن حیدؔر
ٹھہر گئی ہے جدائی کی رات آنکھوں میں

میں ''جادو کے کھیل'' کتاب سے ایک کھیل پڑھ کر اس کا عملی تجربہ کرنے کے لئے ابا جی کے صندوق سے مشک کافور کی ٹکیاں نکال کر لاتا ہوں۔تب ہی ہمارے گھر کے قریب والے گھر کی خوبصورت آنکھوں والی بچی آجاتی ہے۔ میں اسے بتاتا ہوں کہ میں پانی میں آگ لگا سکتا ہوں۔ وہ مجھے بے یقینی سے دیکھتی ہے۔ پھر جب میں مشک کافور کی ٹکیوں کو آگ لگا کر پانی میں آگ کا منظر دکھاتا ہوں تو وہ بے حد حیران ہوتی ہے۔اس کی خوبصورت اور حیران حیران آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوتی ہے۔اپنی آنکھیں کھولتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ وہ پانی میں آگ کے کھیل کی بجائے مجھے بڑی حیرت سے دیکھ رہی ہے۔اس حیرت میں محبت کی مدھم مدھم پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔سحر انگیز پرچھائیاں!

☆☆☆

میں ابھی تک اس کے بچپن کے اس سحر سے ہی نہیں نکل پایا۔ مجھے معلوم ہے جونہی میں اس کے بچپن کے سحر سے نکلا اس کی جوانی کا طلسم مجھے پتھر بنا دے گا اور تب جادو کی کوئی کتاب کوئی علم

اور کوئی اسم مجھے پتھر سے انسان نہ بنا سکے گا۔

وہ مختلف موضوعات پر بے تکان بولے جا رہی ہے۔ اور میں اس سے آنکھیں چار کرنے کی بجائے اپنی لائبریری کی بڑی ٹیبل پر نظریں گاڑے اس کی باتیں سن رہا ہوں۔ اور صرف ''ہوں ہاں'' کر کے اپنا اخلاقی فرض پورا کر رہا ہوں۔

گرمیاں آ گئی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے چھت پر لگے ہوئے تیز بلب کی روشنی میں روشنی کے ڈھیر سارے کیڑے میری ٹیبل پر گر رہے ہیں۔ اتنے چھوٹے کیڑے کے ہلکی سی پھونک سے اُڑ جائیں، میں ایک کیڑے کو پنسل کے ہلکے سے دباؤ کے ساتھ مسل دیتا ہوں۔ ظاہر ہے کیڑا مر چکا ہے، مگر میری حیرت کی انتہا نہیں رہتی جب میں مَرے ہوئے کیڑے کو بھی متحرک دیکھتا ہوں۔۔ میں نگاہیں جھکائے ہوئے اسے متوجہ کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ یہ کیڑا مرنے کے باوجود حرکت کر رہا ہے۔ وہ تھوڑا غور سے کیڑے کو دیکھتی ہے اور پھر ایک کھنکتا ہوا قہقہہ گونجتا ہے۔

میں اس کی طرف دیکھنے کے لئے سر اٹھاتا ہوں مگر پھر گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں۔ میں اس کے بچپن کے خوبصورت سحر میں ہی گھرا رہنا چاہتا ہوں۔ اس کی جوانی کا طلسم مجھے پتھر بنا دے گا۔ اور پھر جادو کی کوئی کتاب، کوئی علم اور کوئی اسم مجھے پتھر سے انسان نہ بنا سکے گا۔

اس کے کھنکتے قہقہے کی گونج ابھی تک کمرے میں موجود ہے اور پھر اس گونج میں سے اس کی آواز سرسراتی ہے۔ وہ کہتی ہے،

''چھت پر لگے ہوئے پنکھے کی ہوا سے کیڑا متحرک نظر آ رہا ہے۔ ورنہ کیڑا تو بے چارہ مر چکا ہے۔'' میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں اور پھر اس مردہ کیڑے کو دیکھتا ہوں جو پنکھے کی ہوا سے متحرک نظر آتا ہے۔

وہ پھر کہتی ہے،

''لیکن جن کیڑوں کو تم نے نہیں مسلا وہ بھی مردہ ہی ہیں۔ یہ سارے کیڑے مردہ ہیں۔ صرف پنکھے کی ہوا سے زندہ معلوم پڑتے ہیں۔ یہ بھی جادو کے کھیل ہیں، قسمت کے کھیل ہیں....ہم جو زندہ ہیں کیا واقعی ہم زندہ ہیں؟''

وہ میرے بے حد قریب آ جاتی ہے اور میں گھبرا کر آنکھیں نیچی کر لیتا ہوں۔ وہ کہے جا رہی ہے:

''کیا واقعی ہم زندہ ہیں؟۔۔نہیں۔۔ہم بھی قسمت کے جادوئی پنکھے کی ہوا کی زد میں آئے ہوئے مردہ کیڑے ہیں۔ جو صرف ہوا کے دباؤ سے متحرک ہو کر زندہ معلوم پڑتے ہیں۔''

وہ میرے بالکل قریب آ کر میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیتی ہے، میں خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں موند لیتا ہوں۔

وہ کہتی ہے۔

''میری طرف دیکھو! میں بھی ایک مردہ کیڑے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور تم بھی.....مگر یہ تم نے آنکھیں کیوں موند رکھی ہیں؟''

''تم صحیح کہہ رہی ہو۔ ہم سب قسمت کے جادوئی پنکھے کی ہوا کی زد میں آئے ہوئے مردہ کیڑے ہیں'' (۔۔۔پھر جادو کی کوئی کتاب، کوئی علم اور کوئی اسم مجھے پتھر سے انسان نہ بنا سکے گا)

اور میں پتھرا جانے کے خوف سے بند آنکھوں پر ہاتھ بھی رکھ لیتا ہوں۔

وہ بڑی ملائمت سے میری آنکھوں پر سے میرے ہاتھ ہٹاتی ہے اور تب ہی میری اس سے آنکھیں چار ہوتی ہیں۔

اس کی غزالی آنکھوں سے روشنیاں طلوع ہوتی ہیں۔

میں پتھر نہیں ہوتا بلکہ میں تو مسلسل پگھلتا جاتا ہوں۔ خوشبوئیں مجھے گھیر لیتی ہیں۔ ایک عجیب سی لذت کا احساس جاگتا ہے۔ میں بے سبب اس سے خائف رہا۔ میں بھرپور نظروں سے اسے دیکھتا ہوں اور روشنیاں اور خوشبوئیں اس کی آنکھوں اور اس کے جسم سے میری روح میں اتر کر رقص کرنے لگتی ہیں۔

میں اس نئے تجربے کی لذت میں گم ہوں۔

مجھے زندگی کا یقین ہونے لگتا ہے۔

وہ بھی خوش ہے مگر اس کی خوبصورت آنکھوں سے ایک انجانی اداسی جھلک رہی ہے۔

''ہم مردہ کیڑے نہیں ہیں۔ ہم زندگی کے گواہ ہیں۔ کم از کم تم اور میں''

میری بات سن کر وہ کچھ اور اُداس ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

شہنائیوں کی دُھن سے میرا وجود سن ہوتا جا رہا ہے۔

چہرے کے علاوہ مرا باقی جسم پتھر ہو گیا ہے۔

میری دائیں طرف وہ لمحہ کھڑا ہے جس میں میں نے اپنے اور اس کے بچپن میں پانی میں آگ کا کھیل کھیلا تھا۔ وہ ابھی تک پانی میں آگ کو دیکھنے کے بعد مجھے حیرت سے دیکھ رہی ہے۔

میری دائیں طرف وہ لمحہ کھڑا ہے جب روشنیاں اور خوشبوئیں اس کی آنکھوں اور جسم سے اُتر کر میری روح میں رقص کرنے لگی تھیں۔

اس کی ڈولی روانہ ہونے والی ہے اور میں اپنے کہے لفظوں کی تردید کرتا ہوں:

''اس نے سچ کہا تھا۔ ہم سب مردہ کیڑے ہیں جو قسمت کے جادوئی پنکھے کی ہوا کی زد میں متحرک ہونے کے سبب زندہ معلوم پڑتے ہیں۔''

اب مجھے اس کی انجانی اداسی کا راز بھی معلوم ہوتا ہے۔

میرا چہرہ بھی پتھر ہونے لگتا ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ میرا سارا چہرہ پتھر ہو جائے اس کے جسم سے میری روح میں اترنے والی خوشبوئیں میری سانسوں میں جم کر مشک کافور کی کئی ٹکیاں سی بن جاتی ہیں۔ اس کی غزالی آنکھوں سے طلوع ہونے والی روشنیوں سے ان میں آگ لگتی ہے اور پھر میری آنکھوں کے پانی میں آگ تیرنے لگتی ہے۔ اور میں اس پانی میں ڈوب کر اور اس آگ میں جل کر خود کو مکمل پتھر ہونے سے بچانے کی آخری کوشش کرنے لگتا ہوں۔

تا کہ زندگی کا کچھ تو بھرم رہ جائے!

☆☆☆

روشنی کی بشارت کے افسانے

جوگندر پال

اگر کسی شخص کا چہرہ اس کے طبع زاد نقوش میں رچا بسا سا لگے اور اس کی شبیہ اور حرکات و سکنات پر کسی مصنوعی ڈیزائن کا گمان نہ گزرے تو اس سے مانوس ہوتے ہوئے کسی تامل کا احساس نہیں ہوتا۔ حیدر قریشی سے مل کر، اس سے بات چیت کر کے یا اسے پڑھ کر بھی ہم جھٹ ہی اس سے مانوس ہو جاتے ہیں اور اس سے مل کر واقعی ہمارا اسی سے ملنا ہوتا ہے۔ اپنے اس بیان سے مجھے حیدر قریشی کی کوئی خارجی شناخت ٹھہرانا مقصود نہیں۔ وہ تو جیسے بھی ہے ویسے ہی ہمارے سامنے ہے۔ مجھے تو خارج کے شواہد میں مضمر اس کے ان امکانات کی ٹوہ ہے جن کی بدولت اس کی روشنی کی بشارت نا قابل یقین معلوم نہیں ہوتی۔ حیدر قریشی کے اس افسانوی مجموعے "روشنی کی بشارت" میں تیرہ کہانیاں شامل ہیں۔ یہ تیرہ مختلف وارداتیں اسے ایک ہی راستے پر پیش آئی ہیں۔ ایک جادہ مستقیم، جہاں یکساں موسم ہیں، زمین اور آسمان کے ویسے ہی خطوط، وہی جھاڑ، جانور، پنچھی اور انسان، اور ان کی بود و باش کا وہی تلمیحی اور تمثیلی انداز، جس کے باعث زندگی پر داستان کا گمان ہونے لگے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ حیدر قریشی کے اس مخصوص ماحول میں جسے جہاں جو کچھ بھی پیش آتا ہے اسے وہاں وہی کچھ پیش آنا عین فطری معلوم ہوتا ہے۔ افسانوں میں واقعیت کا باب دراصل انہی کے سیاق و سباق سے منسوب ہوتا ہے۔ کوئی واقعہ یا کردار از خود جھوٹا یا سچا نہیں ہوتا۔ اس کی سچائیاں --- جزئیاتی سچائیاں بھی ---۔ کسی افسانے کی ایک خاص سچویشن سے وابستگی کے پیش نظر بر محل ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ سوال قطعی طور پر غیر اہم ہے کہ کیا رامائن کا رام چندر سچ مچ کا کوئی شخص تھا یا محض کوئی افسانوی کردار، یا کیا راون کے واقعی دس سر تھے

۔ اہم صرف یہ ہے کہ رام چندر رامائن کا ایک زندہ کردار ہے اور کہ راون کے دس سر نہ ہوتے تو وہ اپنا آپ لگنے کی بجائے کوئی اور معلوم ہوتا۔ زندہ کردار کتابوں میں ہو بہو ویسے ہی سانس لیتے ہیں اور واقعتاً ہوتے ہیں جیسے زندہ لوگ اپنی بستیوں میں زندگی کرتے ہیں۔

افسانہ نگار کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کے کردار زندگی کر کر کے اپنی کہانیاں بناتے ہوئے محسوس ہوں اور ان کہانیوں کے تناظر میں اگر پانی میں آگ لگنا یا انسانی وجود کا پتھرا جانا ہی تخلیقی طور پر صحیح ہو تو ایسے سانحات کو انہونا قرار دے کر ان سے ہاتھ نہ کھینچ لیا جائے۔ ایسا کرنا افسانوی واقعیت کو مجروح کرنے کے مترادف ہوگا۔ حیدر قریشی کے یہاں ایمان کا کراماتی عمل کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ ایمان زندہ رہے تو معجزوں کا رونما ہوتے چلے جانا بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ حیدر قریشی کے ایمان کی توانائی اسے انہدام کی ہیبت سے محفوظ رکھتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے انہدام کے انہدام کا پورا یقین ہے اور اس قیامت کا نظارہ کرنے کے لئے وہ اپنی آنکھیں وا کئے ہوئے ہے۔ ہر چہ بادا باد!

موجودہ آدمی بے چارہ اسی لئے اتنا ہراساں ہے کہ اپنی چھوٹی چھوٹی سہولتی اور نجی دلائل کی بھیڑ میں کھو کر وہ خود پارسا ہو کر رہ گیا ہے اور المناک مضحکہ خیزی سے اس ہمہ گیر زندگی بخش منطق کی بے ضمیر نفی پر تل گیا ہے جس سے بے ریا اجتماعی رفاقتوں کو تقویت پہنچی ہے۔ نمرود کا انکار فی الحقیقت اس کی ہراساں ذہنی کیفیت کا ہی آئینہ دار ہے۔ متوازی خدائیوں کے دعوے دار اپنی بوکھلاہٹوں کے محاصرے میں بالآخر خود آپ ہی اپنی تباہی کا سامان کر لیتے ہیں اور پھر کہیں روشنی کا ہالہ نمودار ہوتا ہے اور از سرِ نو منہدم زندگی کے وجود سے گزر کر ایک خوبصورت تر دور کی ابتداء کی بشارت دیتا ہے۔ "اب بتاؤ کہ تم دونوں رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے"۔

گناہ کو جب تک جرم قرار نہ دیا جائے، ہم اس سے باز نہیں آتے، حالانکہ صرف ہمارے گناہوں کی سزا میں قدرت ہمارے وجود کو ہی سمیٹ کر زنداں منتقل کر دیتی ہے جہاں پنجوں پر کھڑے ہو ہو کے بھی ہم ایک اپنی آنکھوں کے روزن تک نہیں پہنچ پاتے کہ باہری وسعتوں کو روح

میں اتار لیں نئے آدمی نے بہ فخر انانیت کو اپنی ترجیحوں میں روا رکھا ہے اور اوروں کے دلوں میں بسنے کا خواہشمند ہونے کی بجائے اپنے دل کو بھی خون صاف کرنے کی مشین سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہے اور سر سے پاؤں تک لڑھک لڑھک کر ہی ساری عمر بِتا دی ہے۔ ان حالات میں اسے محبت اور سپردگی کے ان کرشموں کا عرفان کیونکر ہو جن کی بدولت وہ کسی حقیر سے حقیر انسان کی بہبود کو اپنی ہی بہبود اور بقا کے اسباب پر محمول کرے۔ "تساں بادشاہ ہوا ساں کوں غریبی" کی طاعت جھیل کر ہی ہم بے لاگ محبتوں کے دروازوں پر پہنچ پاتے ہیں اور یہی دروازے وسیع تر زندگی کی جانب کھلتے ہیں۔

حیدر قریشی اسی وسیع تر زندگی کی دریافت کے لئے اپنی کہانیاں تخلیقتا ہے۔ اپنے اس کھلے کھلے راستے کو طے کر کے اسے دور یا نزدیک کسی شیشے کے محل میں اقامت نہیں اختیار کرنا ہے، بلکہ راستوں سے راستوں تک پہنچنا ہے اور ہر راستے پر تباہ حال زندگی کی باز آباد کاری کئے جانے ہے۔ وہ لکھ لکھ کر گویا کچھ بیان نہیں کر رہا ہوتا، بلکہ اپنے لکھے ہوئے کو کر رہا ہوتا ہے اور اسے ایسا کرتے ہوئے پا کر بے لوث انسانی رشتوں پر باور کر لینا غیر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی تخلیقات میں تاکید اور اصرار کے عناصر کا شاید یہی جواز ہے کہ وہ تحریر کو بے ضرر آرائشوں کی حدود سے باہر لا کر اسے کارکردگی کا فعال ذریعہ بنا لینا چاہتا ہے۔ ایسی ہی تخلیقی شرکتیں گنجان ہو کر آخر کسی دیرپا آہنگ کی پیامبری کی اہل ہو جاتی ہیں۔

میں نے مندرجہ بالا سطور میں لکھا ہے کہ حیدر قریشی کو اپنی ساری وارداتیں اپنے جادۂ مستقیم پر پیش آئی ہیں۔ ایسا نہیں کہ سیدھے راستوں پر کوئی موڑ واقع نہ ہوں۔ اس مجموعے کی کئی کہانیوں میں راستے کہیں تمثیلی باریکی اختیار کر کے اور کہیں اچانک داستانوی پھیلاؤ میں بے ساختہ بل کھاتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور انہیں اس طرح مڑتی ہوئی سیدھ میں دیکھ کر دھیان بے اختیار دلوں کی گزرگاہوں کی طرف ہو لیتا ہے۔ "روشنی کی بشارت" کے آباد کار کی بے چینیاں گواہ ہیں کہ ابھی اسے کہانیوں کے کئی اور شہروں کو منور کرنا ہے۔ مجھے ابھی سے انتظار ہے کہ میرا ان روشن بستیوں میں بھی خوب گھومنا پھرنا ہو۔ ☆☆☆

تاثرات

ڈاکٹر وزیر آغا: پتھر ہوتے وجود کا دکھ "بہت عمدہ افسانہ ہے۔ اگر آپ اسی رفتار اور انداز سے آگے بڑھتے رہے تو بہت جلد صف اول کے افسانہ نگاروں میں شمار ہونے لگیں گے"۔

ڈاکٹر قمر رئیس:" کہانیاں علامتی ہیں لیکن معاصر جدید کہانیوں سے الگ اور انوکھی۔ یہاں تاریخ گنگناتی ہے۔ انسانی تہذیب سرگوشیاں کرتی ہے اور ان کی کوکھ سے آج کے جلتے ہوئے مسائل پھنکار مارتے نکلتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ پرکشش کہانیاں جو سوچنے پر اکساتی ہیں"۔

ڈاکٹر انور سدید:"حیدرقریشی بظاہر ادب کی کئی اصناف میں ایک طویل عرصے سے بڑی پختہ کاری سے تخلیقی کام کر رہے ہیں تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ افسانے کے دیار میں قدم رکھتے ہیں تو فطرت اپنے اسرار کی گتھیاں ان پر باندازِ دگر کھولتی ہے۔"روشنی کی بشارت"ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے لیکن وہ نئے افسانہ نگار نہیں۔ ان کا شمار ساتویں دہے کے ان افسانہ نگاروں میں کرنا مناسب ہوگا جو تجریدیت سے معنی کا نیا مدار طلوع کرتے اور سوچ کو نئی کروٹ دیتے ہیں۔"روشنی کی بشارت" کے افسانوں میں حیدرقریشی کرنوں کے تعاقب میں سرگرداں نظر آتا ہے لیکن جب اسے سدھارتھ کا معصوم چہرہ نظر آجاتا ہے تو اسے اطمینان ہوجاتا ہے کہ اس کل جگ میں زندہ رہنے کا جواز موجود ہے۔

ڈاکٹر حمید سہروردی: حیدرقریشی کے افسانے پریم چند اور یلدرم کے اسلوب ومزاج کی آمیزش اور آویزش سے اپنا ایک نیا افسانوں مزاج اور ڈکشن تیار کرتے ہیں۔ ان کا تجربہ ہم سب کا تجربہ بن جاتا ہے۔ ان کی بصیرت تیز اور روشن ہے اور وہ افسانے کی میڈیم سے روزمرہ زندگی کے انگنت تجربوں کو کچھ اس طرح سے گرفت کرتے ہیں کہ زبان وقلب سے بے ساختہ حیرت اور استعجاب کے کلمات ادا ہوتے ہیں۔ حیدرقریشی اپنے رنگ ومزاج کو اپنے ہر افسانے میں افسانوی زبان کے تخلیقی و اکتسابی امتزاج کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کی خوبی نہ صرف ڈکشن میں ہے بلکہ موضوعات کے برتاؤ میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

میں ذاتی طور پر حیدرقریشی کو جدید تر افسانوی میدان میں کامیاب و کامران سمجھتا

ہوں۔ ان کا یہی انداز توازن وتناسب کے ساتھ برتا جائے تو وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھیں گے اور وہ حضرات جو جدید اور جدید تر افسانے کے باب میں شاکی ہیں اطمینان حاصل کرلیں گے"۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی:"حیدرقریشی الہامی قصص، اساطیر، ذاتی اور معاشرتی مسائل کو آپس میں مدغم کرکے ایک ایسا آئینہ تخلیق کرتے ہیں جس میں پیدائش سے موت تک زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ بیشتر کہانیوں میں میجر کردار خود کہانی کار کی ذات ہوتی ہے اور اس طرح حیدرقریشی فلسفیانہ، مذہبی اور اخلاقی قدروں پر رائے بھی دیتے ہیں تو کسی غیر متعلق یا خارجی خیال آرائی کا احساس نہیں ہوتا اور سب کچھ کہانی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

حیدرقریشی کی کہانیاں زمینی زندگی کے معمولی واقعات سے شروع ہوتی ہیں جنہیں فلو بیر کے لفظوں میں SLICES OF LIFE کہا جاسکتا ہے مگر ان میں جلد ہی مذہبی، عقیدتی اور روحانی رنگ بکھرنے لگتا ہے اور ان کی اٹھان عمودی ہوجاتی ہے۔ پھر ان کہانیوں کی فضا زمین اور آسمان کے بہت بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اکثر کہانیوں کا اسلوب داستانی معلوم ہوتا ہے لیکن لہجہ کا دھیماپن، علامتوں، تمثیلوں اور تلازمے کا استعمال انہیں داستانی رنگ سے الگ بھی کرتا ہے۔ کہیں کہیں مذہبی عقائد کا اظہار بھی ہوتا ہے مگر جمالیاتی طور پر ان میں نہ کوئی خطابیت پیدا ہوتی ہے اور نہ کسی آئیڈیل یا انفرنل دنیا میں داخل ہونے کی ترغیب ہوتی ہے۔ حیدرقریشی کی کہانیوں میں زبان اور حوالہ جات اس وقت، زمانے اور علاقے کی حدوں کا تاثر ضرور دیتے ہیں جب اور جہاں ان کی کہانیوں نے جنم لیا کیونکہ اس سے کسی تخلیق کار کو مفر نہیں، لیکن ان کہانیوں کا مجموعی سپکٹرم زمان اور مکاں کی قید سے آزاد ہوتا ہے اور دنیا کے کسی بھی حصے کا قاری ان کہانیوں میں امکانی سچائی دیکھ سکتا ہے"۔

اکرم محمود(امریکہ): آپ کے پانچ افسانے پڑھے ہیں۔ کیا بات ہے۔ بتا نہیں سکتا کہ کیسا لطف آیا۔ بلا مبالغہ بار بار ایسا محسوس ہوا کہ کسی کیفیت نے میرے پورے جسم کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ افسانہ ختم ہونے پر بھی یہ گرفت ختم نہیں ہوئی۔

☆☆☆